اُمورِ سفارت

سرپرست	---	ڈاکٹر خالد مقبول صدیقی
نگران	---	عبادالرحمٰن ایڈووکیٹ
مدیرِ اعلیٰ	---	عمران حسین
مدیران	---	شکیل صدیقی ، روحیل خان
معاونین	---	عطیہ نیازی، شازیہ ارشاد ، اسد حسین، سیدہ نفیس حسن ، خورشیدالحق، تنویر اسلم ، حیدر امروہوی

ایم کیو ایم امریکہ

مجلّہ "سفیر" کیلئے قائد تحریک جناب الطاف حسین کا پیغام

قلم کی طاقت کو دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے اور قلم کی طاقت ہی کی بدولت عوام الناس میں شعوری بیداری کا عمل تیزی سے فروغ پاتا ہے۔ قلم کی طاقت کو اگر مثبت مقاصد پر استوار رکھا جائے تو یہ عمل انسانیت کی خدمت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے اور اگر اس طاقت کو منفی مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے تو اس کے اثرات انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

مظلوموں، محروموں اور محکوموں کے غصب شدہ حقوق کیلئے چلنے والی تحریکوں میں قلم کی طاقت بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جب کوئی طبقہ، گروہ یا قوم اپنے غصب شدہ حقوق کے حصول کی جدوجہد کا آغاز کرتی ہے تو استحصالی قوتیں جہاں حقوق کی جدوجہد کو کچلنے کیلئے ریاستی طاقت کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں وہیں حقوق کی جدوجہد کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا سلسلہ بھی شروع کردیا جاتا ہے تاکہ مظلوم و محکوم طبقہ کی جائز جدوجہد کو غلط ثابت کیا جائے اور جدوجہد کرنے والوں کا امیج خراب کیا جائے۔ ان حالات میں حرف و ضمیر کا سودا نہ کرنے والے قلمکار اپنے قلم کی طاقت کے ذریعے ہی دنیا میں ظالم کو ظالم اور مظلوم کو مظلوم تحریر کرتے ہیں اور حقوق سے محروم طبقہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ ایم کیو ایم امریکہ یونٹ کی جانب سے امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو وطن کے حالات وواقعات اور متحدہ قومی موومنٹ کی تحریکی جدوجہد سے آگاہ رکھنے کیلئے مجلّہ "سفیر" کا اجراء کیا جارہا ہے۔ اگر یہ سلسلہ مستقل مزاجی سے جاری رکھا جائے تو نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا بھر میں حق پرستی کا پیغام فروغ پائے گا خصوصاً امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو ایم کیو ایم کی جدوجہد کے حوالے سے اہم معلومات حاصل ہونگی۔

اس پرخلوص اور نیک کاوش پر میں ایم کیو ایم امریکہ یونٹ کے تمام ذمہ داران وکارکنان بالخصوص مجلّہ "سفیر" کی ٹیم کے تمام اراکین کو دلی مبارکباد اور خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ مجلّہ سفیر بھی انسانیت کی خدمت اور قلم سے جہاد کا بہترین ذریعہ ثابت ہو، مظلوموں اور محروموں کی ترجمانی کرے اور امریکہ میں مقیم پاکستانیوں میں حق پرستی کا پیغام پھیلانے میں معاون ثابت ہو۔ (آمین)

والسلام

الطاف حسین

خراج تحسین

قائد تحریک جناب الطاف حسین کی سالگرہ کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کے موقع پر مجلہ "سفیر" کا اجراء ہم سب کیلئے انتہائی مسرت کا باعث ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجلہ "سفیر" حق پرستی کا "سفیر" بنکر پاکستان میں حقوق سے محروم عوام کی آواز امریکہ اور دنیا بھر میں بلند کرے گا۔

ایم کیو ایم امریکہ یونٹ کے اراکان اور مجلہ "سفیر" کے شعبے نے جس خلوص محنت اور لگن کے ساتھ جدوجہد کر کے اس مجلے کا اجراء ممکن بنایا ہے اس پر تمام ساتھی زبردست خراج تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سچائی کا اظہار جرأت پیکار کے ساتھ کرنے والے فنکاروں کی موجودگی میں ایم کیو ایم امریکہ یونٹ کے تمام ساتھیوں کو چاہئے کہ اس مجلے کا اجراء نہ صرف باقاعدہ رکھیں بلکہ تحریک کے اہم ایام کے موقع پر خصوصی نمبر بھی شائع کریں تاکہ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کو قائد تحریک جناب الطاف حسین کے فکر و فلسفے اور تحریکی جدوجہد کے حوالے سے مکمل آگاہی حاصل ہو سکے۔

میری جانب سے ایک مرتبہ پھر مجلہ "سفیر" کے شعبے کے اراکان کو اس کامیاب کاوش پر دل کی گہرائی سے مبارکباد اور ان کی مزید کامیابی کیلئے پر خلوص دعائیں۔

والسلام

ڈاکٹر عمران فاروق

کنوینر، متحدہ قومی موومنٹ (پاکستان)

ابتدائیہ

آج ۱۷ ستمبر ہے ۔۔۔ ۱۷ ستمبر کی تاریخ ذہن میں آتے ہی وفاؤں کے دیپ جلتے ہیں ۔۔۔ عقیدت و محبت کے پھول کھلتے ہیں ۔۔۔ وہ تاریخ کہ جس پر قوم کو ناز ہے ۔۔۔ ایسی تاریخ ۔۔۔ جو حق پرستی کا فخر اور اس کا انداز ہے۔

۱۷ ستمبر ۔۔۔ قائد تحریک جناب الطاف حسین کا یومِ پیدائش ہے ۔۔۔ وہ کہ جو علم کا سمندر ۔۔۔ حق و سچ کا پیکر ۔۔۔ عزم و ہمت کا مرکز ۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر ہمارا اور تمہارا رہبر ہے۔

جس کی ذات جدّ و جہد سے تعبیر ہے ۔۔۔ جس کا مقصد بس عہد نو کی تعمیر ہے ۔۔۔ وہ کہ جو حق و سچ کی تصویر ہے ۔۔۔ اور اسکی جدّ و جہد عزم و ہمت سے تحریر ۔۔۔ وہ جو قوم کا معمار بھی ہے ۔۔۔ اسی لئے ۔۔۔ ۱۷ ستمبر ۔۔۔ ہر مظلوم کے لئے خوشی کا تہوار ۔۔۔ وہ جو فکر بھی ہے، شعور بھی ہے اور ترقی کا محور بھی ۔۔۔ جس کی ہر بات اور ہر عمل منزل کی جانب اک قدم ہے ۔۔۔ ایسا قائد کہ جو ہر قدم پر ثابت قدم ہے۔

ہمارا یہ مجلّہ سفیر تحریک کی سفارت کی ذمے داریاں ان تاریخی لمحات میں سنبھالنے جارہا ہے کہ جب تحریک کے قائد کا ۵۳واں جنم دن ہے ۔۔۔ یہ لمحہ اور تاریخ ۔۔۔ خود سفیر کو تاریخ کا حصہ بنانے جارہے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ حق و سچ کا یہ سفیر آنے والے وقت میں اپنی ذمے داریاں بخوبی نبھائے گا۔

آج ہمیں اپنے قائد سے عہد کی تجدید کرنی ہے ۔۔۔ اپنی وفاؤں سے اسکی جدّ و جہد کا خراج ادا کرنا ہے ۔۔۔ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے جدّ و جہد جاری رکھنی ہے ۔۔۔ خود کو ایک نظریاتی کارکن بنانا ہے ۔۔۔ اور وہ تمام لوگ کہ جو اس جدوجہد میں مارے گئے ۔۔۔ ان کے ادھورے خوابوں کی تعبیر بننا ہے۔

ہمیں منزل کا یقین بھی ہے اور قائد پر اعتماد بھی ۔۔۔ تو منزل کے حصول کی جدّ و جہد کو اور تیز کرنا ہے ۔۔۔ اور اپنے ہر عمل کو تحریک کی کامیابی سے مشروط رکھنا ہے۔

حق و سچ کا یہ سفر جاری ہے ۔۔۔ ہمیں اپنے کردار کا تعین کرنا ہے ۔۔۔ کہ یہی وقت ہے، موقع ہے اور تاریخ بھی ۔۔۔ آؤ کہ ہم بھی اس تاریخ کا حصہ بن جائیں ۔۔۔ اور اس جدّ و جہد میں شامل ہو کر تاریخ میں امر ہو جائیں۔

عباد الرحمان

سینٹرل آرگنائزر (ایم کیو ایم امریکا)

سفیر کی ذمے داریاں

(ادارہ)

آزاد ممالک اپنے ملکی مفادات کے لئے اور دوسرے ممالک سے تعلقات بہتر بنانے کے لئے سفارت کاری کا عمل کرتے ہیں اور اس سفارت کاری کے عمل سے اپنے یہاں تجارت اور بیرونی سرمایہ کاری کے مواقع بڑھاتے ہیں۔ اسی طرح جو ممالک بیرونی جارحیت کا شکار ہوتے ہیں وہ اس جارحیت اور جارح کے خلاف دنیا کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے سفارت کاری کرتے ہیں اور سفارت کے اس عمل کے ذریعہ وہ اپنا مقدمہ، اپنی رائے اور اصل صورتحال سے دنیا کی مختلف حکومتوں کو نہ صرف آگاہ کرتے ہیں بلکہ diplomatic channels کے زور پر اپنا مقدمہ جیتنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔

Diplomatic channels یا دوسرے لفظوں میں سفارت کاری کا یہ عمل آج کی مہذب دنیا میں خاصا جانا اور مانا جاتا ہے۔ جہاں ہر ملک اس بات کی کوشش میں رہتا ہے کہ اس کی بات عالمی رائے عامہ میں وزن رکھتی ہو اسی لئے دنیا کے مختلف ممالک اپنے سفارت خانے یا Embassies بناتے ہیں اور وہاں ایسے لوگوں کو بحیثیت سفیر نامزد کیا جاتا ہے کہ جو نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، اپنی قوم اور ملک کے مستقبل کی فکر رکھتے ہوں اور بہتر انداز میں اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے ملک کی نمائندگی کر سکیں، اور اپنے ملک کی پالیسیوں، حکمت عملی کو نہ صرف دنیا کے ایوانوں اور حکومتوں کے روبرو پیش کر سکیں بلکہ انکو Defend بھی کریں۔

دنیا بھر میں چلنے والی انقلابی تحریکیں اپنی آواز اور اپنی جدوجہد کے پیغام کو دنیا بھر میں پھیلانے اور پہنچانے کے لئے کسی نہ کسی ذریعہ یا source کی محتاج ہوتی ہیں اور میڈیا و دیگر وسائل جن کی دسترس سے مکمل طور پر باہر ہوتے ہیں۔

ایسے میں تحریک کے پیغام کو دنیا بھر میں عام کرنے، اپنی قوم کا مقدمہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے انقلابی تحریکوں کے کارکنان رضاکارانہ طور پر اپنی ذمے داریاں سنبھالتے ہیں۔

جس جغرافیہ یا خطہ پر یہ انقلابی جدوجہد جاری ہوتی ہے اس خطہ سے باہر بسنے والے قوم کے افراد اپنی اجتماعی آسودگی اور قوم کے بہتر مستقبل کی فکر میں اپنی ذمے داریاں نبھاتے ہیں اور ایسے ہی کارکنان و ہمدرد اس تحریک اور انقلابی جدوجہد کے سفیر ہوتے ہیں۔

ایسے سفیر کہ جو اپنی اسناد سفارت کسی ملک کے سربراہ کو تو پیش نہیں کرتے لیکن اپنی تحریک کے پیغام کو وہاں بسنے والے عوام کے ساتھ ساتھ اس ملک کے حکمرانوں اور پالیسی سازاداروں تک پہنچاتے ہیں۔

سفیر چاہے کسی ملک کی نمائندگی کرتا ہو یا پھر انقلابی تحریک کا نمائندہ ہو اس کے عمل و کردار ہی سے قوم یا تحریک کے مزاج اور اس کی سچائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انقلابی تحریک کا ہر کارکن اپنی جگہ ایک سفیر کا درجہ رکھتا ہے کہ جس کا اپنی تحریک، جدوجہد اور مشن و مقصد کے بارے میں علم اس قدر مکمل ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی مقام پر تحریک کا مقدمہ پیش کر سکے اور اپنے مقدمہ کے حق میں سچائی پر مبنی دلائل بھی دے سکے۔

(سفیر کی ذمہ داریاں) ۲

ایسی کسی بھی انقلابی تحریک کے سفیر پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی تحریک کی پالیسیوں، حکمت عملی اور مقاصد سے ہر لمحہ آگاہ ہو اور اس کا عمل و کردار تحریک کا عکس ہو۔ تحریک کے سفیر اس لحاظ سے انتہائی منفرد ہوتے ہیں کہ یہ پیشہ ور سفیروں کی طرح اپنی ملازمت اور مفادات کی ہرگز پرواہ نہیں کرتے بلکہ اپنے ہر عمل Action کو تحریکی جد و جہد کا حصہ بناتے ہیں۔

آج ہم اور آپ بھی اپنے شہروں، گلیوں اور محلوں سے بہت دور امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور دنیا کے دیگر حصوں میں آباد ہیں یا پھر حالات کے جبر کی بنا پر یہاں جلاوطن ہیں۔

ہماری اور آپ کی تحریک MQM پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے تو ایسے وقت میں ان ممالک میں موجود تحریک کے کارکنان اور قوم کے افراد نے تحریک کے سفیر کا کردار بھرپور انداز میں ادا کیا اور امریکہ سے افریقہ اور آسٹریلیا سے برطانیہ تک ان مظالم پر ایسے تاریخی مظاہرے کئے کہ جن کی مثال شاید ہی ملتی ہو۔ انھوں نے پاکستان میں موجود اپنی ماؤں بہنوں، اپنے بزرگوں اور نوجوانوں کی تکالیف ان پر ہونے والے ریاستی ظلم و ستم کو دیارِ غیر میں رہتے ہوئے محسوس کیا اور اس پر عملی احتجاج بھی کیا۔

ہم اور آپ تحریک کے سفیر ہیں۔ تحریک کے پیغام کو دنیا بھر میں پھیلانے کے ساتھ ہی ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ اپنے عمل و کردار کو تحریک کے بنیادی سانچے میں ڈھالیں۔ جہاں ہم نے بدترین حالات میں تحریک اور قوم کا مقدمہ دنیا بھر کی عدالتوں اور ایوانوں تک پہنچایا تو آج یہ لازم ہے کہ ہم نئے حالات و واقعات کی روشنی میں اپنی سفارت کاری کے عمل کی از سرِ نو تنظیم کریں۔

ہمیں نہ صرف تحریک کے کام کو تیز کرنا ہے بلکہ دیارِ غیر میں پلنے اور بڑھنے والی اپنی نوجوان نسل کو تحریک کا vision بھی دینا ہے۔ ایک سفیر کے طور پر ہمیں Nation building کا کام بھی کرنا ہے کہ تحریکوں کا بہتر مستقبل اسی وقت محفوظ ہاتھوں میں ہوتا ہے جب ایک بہترین اور باصلاحیت قوم تیار ہو۔

آج ہمارے اوپر بے پناہ ذمے داریاں ہیں اور وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم تحریک اور حق و سچ کی اس جد و جہد میں اپنے بنیادی کردار کو خوش اسلوبی سے پورا کریں اور تحریک کے پیغام اور فکر کو دنیا بھر میں پھیلاتے جائیں۔

کہ یہی قوم کے ہر فرد کی بیداری بھی ہے .... اور ایک سفیر کی ذمے داری بھی

پیغامِ سفیر

آج امریکہ سمیت دنیا بھر میں بانی و قائد تحریک جناب الطاف حسین کا ۵۰ واں یوم پیدائش پورے جوش و جذبے اور عقیدت و محبت کے ساتھ منایا جا رہا ہے۔

سفیر کی جانب سے تمام حق پرست ماؤں، بہنوں، بزرگوں اور نوجوانوں کو ۔۔۔ ایم کیو ایم کے چاہنے والوں کو ۔۔۔ نظریہ کے ماننے والوں کو اور حق و سچ کے متوالوں کو ان کے محبوب قائد کا ۵۰ واں یوم پیدائش مبارک ہو۔

اس مبارک اور تاریخی موقع کو یادگار بنانے کے لئے، تحریکی کارکنوں و ہمدردوں کے عزم کو مجتمع کرنے اور انکے احساسات و جذبات کو جاننے کے لئے ہم نے اس مجلہ کی اشاعت کا فیصلہ کیا اور ہمیں امید ہے کہ یہ سفیر اپنی بات یعنی حق و سچ کی بات آپ تک پہنچائے گا اور ہماری فکری و نظریاتی تربیت کا سیر حاصل سامان کرے گا۔

۲۰۰۳ء ہماری تحریکی جدّوجہد میں اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل رہے گا کہ چند ماہ قبل ہی ہم نے حق پرستی کی اس تحریک کی سلور جوبلی منائی اور آج ۱۷ ستمبر کی یہ مبارک تاریخ تحریک کے قائد کی گولڈن جوبلی کا عندیہ لے کر آئی ہے۔ جہاں اس سال نے ہمیں تحریک اور انکے قائد کے حوالے سے دوہری خوشیاں منانے کا موقع فراہم کیا وہیں یہ سال ہمیں یہ پیغام بھی دے رہا ہے کہ جدّوجہد اور قائد لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ہمیں جدّوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو صرف اور صرف قائد کی تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا، اسی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا ہوگا، اسی کی فکر اور نظریے سے اپنا اور قوم کا مستقبل تراشنا ہوگا۔ تحریک کو امر کرنا ہے تو اپنے قائد کے ہاتھوں کو مضبوط کرنا ہوگا، اس کی قیادت پر مکمل اعتماد کرنا ہوگا کہ اس کے شب و روز ہی سے ہماری صبح نے طلوع ہونا ہے اور ایک نئے عہد نے جنم لینا ہے۔

۱۱ جون ۱۹۷۸ء کو آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا قیام جہاں حقوق سے محروم قوم کی جدّوجہد کا نکتہ آغاز تھا تو وہیں علم کے سمندر، حق و سچ کے پیکر، عزم و ہمت کے مرکز اور تمام تر قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال جناب الطاف حسین کی قیادت کا روزِ اوّل بھی تھا کہ جب جناب الطاف حسین نے حقوق سے محروم کچلی ہوئی مہاجر قوم کو جدّوجہد کا درس دیا اور پھر اس جدّوجہد کو عملی رنگ بھی دیا۔

۱۱ جون ۱۹۷۸ء، ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء اور ۲۶ جولائی ۱۹۹۷ء ہماری جدّوجہد میں یہ تمام ہی اہم تاریخیں اور ان سے منسلک تمام ہی کامیابیاں بانی و قائد تحریک الطاف حسین کی قیادت کے سر ہیں۔

قائد تحریک جناب الطاف حسین نے حق و سچ کی جس آواز کو بلند کیا تھا وہ آواز آج سندھ کے شہری علاقوں سے نکل کر پاکستان بھر کے شہروں اور دیہاتوں میں آوازِ انقلاب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ شعوری بیداری کا جو سفر قائد تحریک نے آج سے پچیس برس قبل شروع کیا تھا اس نے پاکستان کے فرسودہ جاگیردارانہ و سیاسی نظام میں دراڑیں ڈالنا شروع کر دی ہیں۔

آج امریکہ سے مجلہ "سفیر" کی اشاعت اس بات کو واضح کردینے کے لئے بہت کافی ہے کہ سفیرِ حق جناب الطاف حسین کا پیغام نہ صرف پاکستان میں پھیل رہا ہے بلکہ دنیا بھر میں اس پیغامِ حق کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جارہا ہے کیونکہ حق کے چاہنے والوں پر یہ لازم ہے کہ وہ حق کے پیغام کو خود تک محدود نہ رکھیں۔

"سفیر" کی اشاعت اور یہاں امریکہ میں بڑھتے ہوئے تنظیمی کام سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سچا نظریہ ایک خوشبو کی مانند ہوتا ہے اور خوشبو کا کام محض پھیلنا ہوتا ہے۔ نظریاتی سوچ رکھنے والے جغرافیائی حدود کے پابند نہیں ہوتے بلکہ جہاں جاتے اور بستے ہیں اس بستی میں اور وہاں بسنے والوں کے دلوں میں اپنا گھر کرلیتے ہیں۔

تحریک مسلسل سیکھنے کا عمل ہے اور یہ ہماری ذمے داری ہے کہ جہاں بھی موجود ہوں اس معاشرے کا باریک بینی سے جائزہ لیں اور اس کے مثبت پہلوؤں کو اپنائیں۔

آج امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک اور سپر پاور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہاں امریکہ میں مقیم ایم کیو ایم کے کارکنان کو اپنے ذہن اور اپنی نظر سے اس کی ترقی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنا ہوگا اور ان سے حاصل نتائج کی بنیاد پر تحریک اور قوم کے روشن مستقبل کے لئے خود کو تیار کرنا ہوگا کہ یہی نظریاتی لوگوں کا کام ہے کہ وہ جس معاشرے میں بھی رہیں اپنی نظریاتی سوچ و فکر کو متاثر کئے بغیر اپنے علم کی وسعتوں کو قوم کی اجتماعی تعمیر و ترقی کا مرکز بنائیں۔ ہمیں خود کو علم اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں منوانا ہوگا کہ یہی آج کے دور میں غلامی سے نجات کا طریقہ بھی ہے اور زندہ قوموں کو جانچنے کا پیمانہ بھی۔

آج ۱۷ ستمبر کی مبارک تاریخ بھی ہے اور اپنے قائد سے تجدیدِ عہد کا سنہری موقع بھی۔

قائد سے تجدیدِ عہدِ وفا کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم خود احتسابی کے عمل کو اپنائیں اور اپنے تحریکی عمل و کردار کا از خود جائزہ لیں۔ احتساب کی ایسی مثال قائم کریں کہ جہاں ہم خود ہی وکیل ہوں اور خود ہی منصف اور اپنے عمل کا فیصلہ اپنے ضمیر کی عدالت سے لیں۔ خود احتسابی کا یہ عمل جس قدر صاف و شفاف ہوگا اور تمام تر مصلحت پسندی سے پاک ہوگا ہمیں تحریک کا ایک مثالی کارکن اور بہتر سفیر بننے میں اسی قدر مددگار ہوگا۔

آج ہمیں یہ عہد بھی کرنا ہوگا کہ شہیدوں کی لازوال قربانیوں کو کسی صورت رائیگاں نہیں جانے دیں گے اور خود کو نظریاتی طور پر مسلح کرکے اپنے قائد کے بازو بنیں گے۔

تیزی سے بدلتی ہوئی عالمی صورتحال میں وہی تحریکیں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچیں گی کہ جو خود کو زندہ رکھیں گی اور اپنی جدّ و جہد سے اپنی حیثیت کو منوائیں گی۔ ہماری جدّ و جہد اور ہماری حیثیت کو دنیا بھر میں تسلیم کیا جاچکا ہے ہمیں اب صرف عزم و ہمت اور ثابت قدمی سے اپنی جدّ و جہد کو زندہ رکھنا ہے کہ کب، کیسے اور کہاں شہیدوں کے صدقے ہمیں ہماری منزل مل جائے۔ اور ہماری جدّ و جہد کامیابی سے ہمکنار ہو۔

آخر میں ہم تمام قلمکاروں کے شکر گذار ہیں کہ جنہوں نے "سفیر" کے لئے اپنی نگارشات ہمیں بھیجیں اور ان تمام قلمکار ساتھیوں سے معذرت کہ جن کی تحریر جگہ کی کمی یا تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہوسکیں۔

والسلام

آپ کا سفیر

اعتِبار

سید اسد شبیہ

سلسلہ وفا کا یوں استوار رکھنا ہے
منزلیں یقینی ہیں ، اعتبار رکھنا ہے

کون ہو کہاں کے ہو، گر کبھی سوال اُٹھے
آنکھ پُر غضب ، لہجہ پُر وقار رکھنا ہے

عشق پیشہ لوگوں کا ایک ہی ترانہ ہے
جان وار دینی ہے، دِل نثار رکھنا ہے

کربلائے ثانی کی آخری لڑائی تک
ذہن اور حواسوں پر اختیار رکھنا ہے

ہو سکے اگر تم سے اپنی ہر خوشی بانٹو
ذات میں نہاں غم کو بے شمار رکھنا ہے

اُردو کا سفر

تنویر اسلم

جسطرح کائنات میں حیات کا ارتقا خود انسان کے ارتقاء کی تاریخ بن جاتا ہے۔ اسی طرح زبان کا ارتقاء کسی تہذیب کی تاریخ کا زریں باب بن جاتا ہے۔ اور انسان و حیوان میں یہی فرق ہے کہ انسان کے پاس بولتی ہوئی زبان ہے، حیوان کی زبان گنگ ہے۔ یہی بولتی زبان انسانی شعور کی علامت ہے۔ اسکے دکھ درد، خوشی، غمی، خیال، احساس، جذبہ و فکر و تجربے کا اظہار اسی سے زندگی میں نئے رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ اور زندگی کے بوٹے، پھیلنے اور بامقصد اور بامعنی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے زبان معاشرت کے پہلے درجے سے شروع ہو کر انسانی معاشرت کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور انسانی زندگی کا پہلا اور بنیادی ادارہ بن جاتی ہے۔ انسانی شعور اسے ابھارتا ہے۔ خیالات کا نظام اسے روشنی دیتا ہے، زندگی کے مختلف عوامل اور تجربے اسے بناتے اور سنوارتے ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی، اعلیٰ اور ادنیٰ چیز یا تصور، تجربہ، احساس زبان کا لباس بن کر فہم کی شکل میں آجاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ زبان نہ کوئی فرد ایجاد کر سکتا ہے اور نہ اسے فنا کر سکتا ہے۔ اردو زبان پر یہ اعتراض کہ اسنے برصغیر کی کوکل کو چھوڑ کر ایران کی بلبل سے دل لگایا۔ یہ بات قدیم ادب کے مطالعے سے غلط ثابت ہو چکی ہے۔ آج جو حیثیت انگریزی و مغربی ادب کی ہے، قدیم دور میں وہی حیثیت فارسی زبان و ادب کی تھی۔ اس زبان کو تہذیبی و سیاسی حیثیت بھی حاصل تھی اور اسکی بلند پایہ ادب کی طویل روایات بھی موجود تھیں۔ اس دور میں اس کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ چنانچہ ان تبدیلیوں کو اور ان دو طرز ہائے احساس کی کشمکش کو اور ہندوی روایت سے فارسی روایت تک پہنچنے کے سفر کو واضح طور پر دکھانے کی کوشش کی ہے۔

اورنگزیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد شمال اور جنوب گھر آنگن بن جاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ اردو ادب کی دکنی روایت دم توڑ دیتی ہے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ ولی دکنی کی شکل میں خود شمال کو فتح کر لیتی ہے۔ ادب کا علاقائی رنگ اڑ جاتا ہے اور جنوب کی طویل روایت ادب شمال کی زبان اور لہجے سے مل کر ایک نیا عالمگیر معیار ادب تلاش کر لیتی ہے۔ جو سارے برِاعظم کے لئے یکساں طور پر قابلِ قبول ہو جاتا ہے۔ زبان و ادب کے اس نئے معیار کا نام ریختہ ٹھہرتا ہے، اور غزل اسکی ممتاز صنف قرار پاتی ہے۔ ولی دکنی اس دور میں بیک وقت دو کام کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ قدیم ادب کی روایت کے دھارے کو تصرف میں لا کر فکر و اظہار کی نئی سطح سے ملا دیتا ہے۔ دوسرے اردو زبان و ادب کو فارسی طرزِ احساس میں ڈھال کر معاشرت کی اس خواہش کو پورا کر دیتا ہے، جو ایک طرف فارسی زبان کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا، اور دوسری طرف خود فارسی زبان میں تخلیق کرنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔

جسطرح انگریزی زبان نے فرانسیسی ادب کے نمونوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اسی طرح کم و بیش یہی عمل اردو زبان کے ساتھ ہوا۔ مسلمانوں کے اقتدار، حکمرانی کے زمانے میں، انکے کلچر، انکی روایت اور انکی زبانوں کا گہرا اثر پڑا۔ فارسی، ترکی اور عربی لغات اس زبان میں داخل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس میں جذب ہو گئے۔ ایک گری پڑی زبان میں اظہار کی قوت تیز

ہو گئی۔ نئے الفاظ اور نئے خیالات نے احساس و شعور کو نیا سلیقہ دیا اور اسی کے ساتھ ادبی تخلیق کا بازار گرم ہو گیا۔ اردو شعراء کے سامنے فارسی ادب و اصناف کے نمونے تھے۔ انھوں نے ان نمونوں کو معیار بنا کر دل و جان سے قبول کر لیا۔

اردو زبان بھی اپنی تشکیل کے دور سے گزر رہی تھی اور اس معیار تک نہیں پہنچی تھی جہاں زبان کا ادبی معیار علاقائی و مقامی سطح سے اٹھ کر عالمگیر ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ جہاں جہاں یہ زبان پہنچی، وہاں وہاں علاقائی اثرات کو جذب کرکے اپنی شکل بدلتی رہی۔ اسکا ایک ہیولی سندھ و ملتان میں تیار ہوا۔ پھر یہ لسانی عمل سرحد و پنجاب میں ہوا۔ جہاں سے تقریبا دو صدی کے بعد یہ دلی پہنچا اور وہاں کی زبان کو جذب کرکے اور ان میں جذب ہو کر سارے برصغیر میں پھیل گیا۔ گجرات میں یہ زبان گجری کہلائی، دکن میں اسے دکنی کے نام سے پکارا گیا۔ کسی نے اسے زبان ہندوستان کہا کہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ کسی نے اسے ہندی یا ہندوی کہا۔ کسی نے اسے لاہوری یا دہلوی کے نام سے موسوم کیا اور اسی حساب سے کسی نے اس کا رشتہ، برج بھاشا سے جوڑا۔ کسی نے اسے کھڑی بولی سے ملایا، کسی نے اسے زبان پنجاب کہا، کسی نے سندھی و سرائیکی علاقے کو اسکا مولد بتایا۔

مختلف زبانوں سے اسکا یہ تعلق اور مختلف زبانوں کے علاقوں کا اس پر یہ دعوی، اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے سب سے فیض اٹھا کر اپنے وجود کو انفرادیت بخشی ہے۔ اسی لئے یہ زبان برصغیر کی سب زبانوں کی زبان ہے۔ اور ہمیشہ کی طرح آج بھی سارے برصغیر کی واحد لنگوا فرینکا ہے۔ ماہر لسانیات پر یہ بات چھوڑتے ہوئے ہمارے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ یہ سب کی منہ چڑھی زبان ہے جسے آج ہم اردو کے نام سے پکارتے ہیں۔

خود احتسابی ..... مثالی کارکن کی اساس

خورشید الحق

قائد تحریک جناب الطاف حسین نے حال ہی میں ایم کیو ایم کے تنظیمی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے انقلابی فیصلے کئے اور ایک بار پھر تحریک کے ذمے داروں اور کارکنان پر زور دیا کہ وہ اپنی روش کو بدلیں اور خود کو فوری طور پر تنظیم کا ایک نظریاتی کارکن بنائیں۔ ایک ایسا کارکن کہ جسکی تمنا تحریک کا قائد کر رہا ہے۔ آخر ایسا کارکن ملے گا کہاں؟

کیا یہ کارکن ہم اور آپ سے مختلف ہے؟ اور اگر ہے تو کن بنیادوں پر؟ اور ہم تحریک کے ایسے نظریاتی و مثالی کارکن کیسے اور کس عمل (Process) سے گذر کر بن سکتے ہیں؟

یہ بہت ہی بنیادی سوال ہے مگر اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب حاصل ہونے پر ہی ہم اپنے آپ کو تحریک کا ایک مثالی کارکن ثابت کر سکتے ہیں۔

کسی کو جانچنا، پرکھنا، اسکی غلطیوں یا غلط کاریوں سے پردہ اٹھانا، اسکے اچھے اور برے عمل کا محاسبہ کرنا اور پھر اسکے عمل کی بنیاد پر اسکی تصحیح کرنا یا اس کو جزاء و سزا کا حقدار ٹھہرانا دراصل کسی بھی معاشرے یا اجتماعی سطح پر "احتساب" کا عمل کہلاتا ہے۔

یہ احتساب کا عمل کسی بھی قوم کی اجتماعی خرابیوں، معاشرتی و سماجی برائیوں اور اسکے ماضی و حال سے متعلق کئے گئے فیصلوں کی نہ صرف سرزنش کرتا ہے بلکہ ایک ایسے مسیحا کا کردار بھی ادا کرتا ہے کہ جو قوم کو لاحق اجتماعی بیماریوں سے اسے نجات دلاتا ہے۔

اسی طرح جہاں کسی معاشرے یا سرزمین پر قوموں کی جانب سے حقوق کی جدوجہد جاری ہو یا یوں کہیئے کہ انقلاب کے حصول کے لئے اجتماعی تحریک اپنے پورے آب و تاب پر ہو تو وہاں ایسی کسی بھی تحریک میں شامل اس کے کارکنان و ذمے داران کا کردار اور ان کی جانب سے کیا جانے والا عمل پوری تحریک اور جدوجہد پر مثبت یا منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ کئی بار یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی ایک کارکن یا ذمے دار کے انفرادی فیصلوں کی وجہ سے تحریکوں کو بے پناہ نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔

انقلابی تحریکوں میں کارکنان کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے کہ جہاں تحریک کا قائد اپنے کارکنان سے اس بات کی ہر لمحہ توقع رکھتا ہے کہ وہ نہ صرف نظریاتی طور پر مضبوط رہیں گے بلکہ اپنے فیصلوں میں بھی اپنے ذاتی مفادات کی ہمیشہ نفی کریں گے اور قائد کے اعتماد پر پورا اترتے ہوئے تحریکی جدوجہد میں اپنا بھرپور کردار ادا کرینگے۔

جس طرح اجتماعی بنیادوں پر احتساب کا عمل قوموں کو مکمل تباہی و بربادی سے دور رکھتا ہے اسی طریقے سے اپنے آپ کو جانچنا، سمجھنا، پرکھنا، اپنے اچھے و برے عمل کا محاسبہ کرنا اور بغیر کسی مصلحت پسندی کے اپنے غلط عمل کو غلط تسلیم کرنا، اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے اس کی تصحیح کرنا اور پھر اپنی ذات سے اس بات کا عہد کرنا کہ آئندہ ایسا کوئی غلط عمل سرزد نہیں ہوگا دراصل "خود احتسابی" کا عمل کہلاتا ہے۔

(خود احتسابی - مثالی کارکن کی [illegible])

خود احتسابی کا یہ عمل اگر صاف و شفاف ہو اور تمام تر مصلحت پسندی سے پاک ہو تو پھر یہ خود احتسابی کسی بھی انسان کے کردار میں انقلابی تبدیلیاں لے آتی ہے اور ایسا انسان اپنے ذاتی خول سے باہر نکل کر دوسروں کی بہتری و بھلائی کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

کسی بھی ایک عام انسان سے زیادہ خود احتسابی کا یہ عمل انقلابی تحریک کے ایک کارکن کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ تحریک کا ایک ایسا کارکن کہ جس کے ہر عمل سے تحریک کو فائدہ یا نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے یا یوں کہیئے کہ اسکا انفرادی عمل تحریک کے اجتماعی عمل و سوچ کو اثر انداز کر رہا ہوتا ہے تو وہاں خود احتسابی کا یہ عمل ہی ایک مثالی کارکن کی اساس بنتا ہے۔

ایک مثالی کارکن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی حرکات و سکنات اپنے کردار و عمل کو مکمل طور پر تحریک کے سانچے میں ڈھالے اور اس بات کا جائزہ لے کہ جس مشن اور مقصد کے لئے وہ اس انقلابی جدوجہد کا حصہ بنا ہے کیا وہ اپنے کردار سے مطمئن ہے؟

وہ جس نظریاتی جدوجہد میں شامل ہے کیا وہ خود اس نظریہ پر مکمل طور پر یقین رکھتا ہے؟

کیا وہ اس نظریہ کو اپنی ذات کا حصہ بنا چکا ہے؟

وہ جس قائد کا کارکن ہے کیا وہ اس قائد کی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل پیرا ہے؟

وہ جس قوم کا ترجمان ہے کیا وہ اس قوم کی امنگوں کا مکمل پاسدار بھی ہے؟ کیا وہ اپنی ذاتی انا کو فنا کر چکا ہے؟

کیا اس کے شب و روز تحریک کی جدوجہد سے وابستہ ہیں؟ وہ اور اسکا ہر عمل تحریکی فکر و فلسفہ سے مطابقت رکھتا ہے؟

کیا وہ اپنا سب کچھ تحریک پر قربان کرنے کے لئے تیار ہے؟

اور اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر کیا وہ تحریک کا ایک مثالی کارکن کہلانے کا حقدار ہے؟

یہ تمام ہی سوالات خود احتسابی کے عمل کا احاطہ کرتے ہیں اور ہر انقلابی تحریک کے کارکن پر لازم ہے کہ وہ ان سوالات کی بنیاد پر اپنے کردار و عمل کا جائزہ لے۔

خود احتسابی کا یہ عمل بالکل ایسا ہی ہے کہ نہ آپ عوام کی عدالت میں پیش ہونگے اور نہ ہی حکمران آپ کا احتساب کریں گے بلکہ آپ خود ہی وکیل اور خود ہی منصف ہوں گے اور اپنے ہر عمل کا فیصلہ اپنے ضمیر کی عدالت میں لیں گے۔

ہم اور آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہم ایم کیو ایم کی انقلابی جدوجہد کا حصہ ہیں اور آج ۱۷ ستمبر ۲۰۰۰ کو بانی و قائد تحریک جناب الطاف حسین کے یوم ولادت کے مبارک موقع پر ہمیں قائد سے اپنے عہد کی تجدید اس انداز میں کرنی ہے کہ ہم خود احتسابی کے عمل کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنائیں گے اور خود کو فکری و نظریاتی بنیادوں پر مضبوط بنا کر تحریک کے ایک مثالی کارکن بنیں گے۔

—— یہی قائد کا ہم سے تقاضہ بھی ہے —— اور قائد سے تجدید عہد کا بہترین انداز بھی۔

غزل

عطیہ نیازی

جو بے خبر ہیں، انہی سے صلاح مانگتی ہے

بے رُکس تماش کی بستی، فلاح مانگتی ہے

کسی کے ہو، نہ کبھی تھے، کسی کے کیوں ہو گے؟

یہ بے بے وقوف تمہی سے نباہ مانگتی ہے

وہ راستوں کی رکاوٹ ہیں اور رہزن ہیں

یہ شمع ایسی ہواؤں سے راہ مانگتی ہے

مچا ہے شورِ قیامت، یہ مغربی دنیا

ہر اِک ثواب کے بدلے گناہ مانگتی ہے

حضور والئی عزت مآب، عالم پناہ!

حضورِ آپ سے عطیہ پناہ مانگتی ہے

حقیقت پسندی و عملیت پسندی

(منتخب تحریر)

ڈاکٹر خالد مقبول صدیقی

حقیقت سچائی کا دوسرا نام ہے...... حقیقت کی تلاش سچائی کی تلاش ہے اور حقیقت پسندی ہی دراصل سچائی کا راستہ ہے۔ کسی دانشور نے کہا ہے کہ سچائی منزل بھی ہے اور منزل تک پہنچنے کا راستہ بھی لہٰذا سچائی کی تلاش بھی سچی ہونی چاہیئے کیونکہ سچی تلاش خود ترقی یافتہ سچائی ہے۔ آج کا ترقی یافتہ دور سائنس کا دور ہے ٹیکنالوجی کا، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ آج کے دور میں تیز رفتار ترقی کی وجہ سے فاصلے سمٹ اور سمٹ چکے ہیں اور پوری دنیا ایک گلوبل ویلج بن گئی ہے آج کا ترقی یافتہ انسان قدرت کے ہر سربستہ راز کو معلوم کرنے کے لئے بے چین ہے۔ آج کے انسان کے ارتقاء یافتہ ذہن نے صرف مرئی چیزوں کی حقیقت کھوجنے کی لگن پیدا نہیں کی بلکہ وہ غیر مرئی چیزوں کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی بھی جستجو کر رہا ہے۔ پچھلی صدی میں انسان نے عنصر کی اکائی یعنی ایٹم پر تحقیق کر کے ایٹمی توانائی بھی پیدا کی اور ایٹمی تباہی بھی لیکن اس صدی، ۲۱ ویں صدی کے انسان کی جستجو کا میدان خود انسانی اکائی یعنی جین Gene ہے جس کے ذریعے وہ آنے والے دنوں میں ایک بہتر بلکہ مکمل انسان کے خدوخال تشکیل دینے میں مصروف ہے۔ آج کے دور کا انسان جسمانی بیماریوں ہی کی وجوہات اور علاج تلاش نہیں کر رہا بلکہ وہ روحانی و باطنی بیماریوں کا علاج اور ان کی وجوہات بھی تلاش کر رہا ہے آج کا انسان صرف جسم و جاں کے رشتے کو جاننے پر اکتفا نہیں کر رہا بلکہ وہ جسم کے ساتھ روح کے جڑے تعلق کو بھی تلاش کر رہا ہے۔ آج کا انسان زندگی کے آغاز پر ہی بحث نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ موت کے بعد کے امکانات کا بھی سائنسی بنیادوں پر جائزہ لینے کی ہمت کر رہا ہے۔ آج کا انسان دماغ کی ساخت، خانوں اور درجوں کے بارے میں علم رکھنے کے ساتھ ساتھ دماغ میں سوچ کے پیدا ہونے کے عمل کی بھی درجہ بندی کر رہا ہے سوچ کے مختلف حصوں اور خانوں کو تلاش کر رہا ہے اس نے دماغ میں موجود سوچ کی دنیا کو چلانے والے دفتر اور افسر کا بھی تعین کیا ہے۔ اس نے دماغ میں موجود سوچ کے دفتر کے آرکائیو Archive اور آپریشن ٹیبل کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے آج کا انسان قدرت اور فطرت کے رازوں سے ڈر نہیں رہا بلکہ انہیں ڈھونڈ رہا ہے اور ان سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا ہے بہر حال آج کا انسان حقیقت اور سچائی میں سرگرداں ہے۔ سچائی کی تلاش کے لئے سچی جستجو، لگن، سچی کمٹمنٹ اور ارادے کا سچا ہونا لازمی امر ہے۔ سچائی کی تلاش و جستجو اور قدرت کے رازوں کے بے نقاب ہونے کے عمل نے جہالت، فرسودہ روایات، توہمات اور عقیدوں کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیئے ہیں آج انسان مذہب کی سائنس اور میٹا فزکس کے بارے میں سینہ تان کے بات کر رہا ہے اور مذہب کی اصلیت کو جاننے سے بھی نہیں کتراتا۔ انسان کا ارادہ اگر سچا ہو تو سچائی خود چل کے اس کے پاس آتی ہے انسان کا انفرادی ارادہ انسان کی تعمیر کرتا ہے اور انسانوں کا اجتماعی ارادہ معاشرے کی تعمیر کرتا ہے انسانوں کا اجتماعی ارادہ ہی دراصل کسی معاشرے کی بنیاد ہوتا ہے اگر انسانوں کے انفرادی ارادے اور اجتماعی ارادے متصادم نہ ہوں تو ایک مثالی معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے ایک ایسا ذاتی ارادہ جو قومی مفاد کی غرض سے اجتماعی ارادے کے تابع ہو دراصل ایک منصفانہ آزاد اور ارتقاء یافتہ معاشرے اور سماج کی سند ہوتا ہے۔ ارادے کی بنیاد اور سچائی کی تلاش کے لئے "فکر" قطب نما کا بھی کام کرتی ہے اور ایندھن کا بھی...... ملاوٹ اور کثافت سے پاک خالص غیر متعصب حقیقت پسندانہ سوچ و فکر قدرت اور فطرت کے مظاہر کو پرکھنے اور سمجھنے اور سچائی کو تلاش کرنے کے لئے دیدہ بینا بھی عطا کرتی ہے اور ذہن رسا بھی پیدا کرتی ہے۔

ہر عہد میں انسان اور معاشرے کی باہمی ضرورت اور ارادوں نے جس میں انسان کی اپنی شناخت اور پہچان کی فطری خواہش بھی شامل ہے معاشرے اور سماج میں نت نئے تقاضے پیدا کئے، نئے قوانین اور نئے اصول وضع کئے، نئے نظام اور نئے معاشرے کی بنیادیں پڑتی رہیں، انسان میں جدت اور انسانی ذہن میں ارتقاء کا سفر جاری رہا سوچ و فکر میں تجلی و ترقی اور مشاہدے اور مطالعہ میں گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جس جس عہد، جس جس معاشرے اور سماج میں ذاتی ضروریات، تقاضے اور ذاتی ارادے، اجتماعی ارادے سے باہم متصادم نہیں ہوئے اور اس کے

زیر اثر ہے انسان ترقی اور تعمیر کی دوڑ میں رہا۔ جس انسان نے پہلے پہل آگ پیدا کی۔ جس نے زمین سے پہلے پہل غلہ اگایا جس نے قلم کاغذ اور روشنائی تخلیق کی۔ جس نے کل پہیہ بنایا، بجلی پیدا کی، چرخہ بنایا، سوت کاتا۔ جس نے جڑی بوٹیاں تلاش کیں ان سے علاج کی ابتدا کی، دھاتیں پگھلائیں اور انہیں سانچوں میں ڈھالا، سمندر کے سفر کی ہمت کی۔ کشتی تعمیر کی، جانوروں کو سدھایا، اس انسان کی جستجو اور جدوجہد اور ارتقاء کا عمل جاری رہا، وقت گذرنے کے ساتھ اس جدوجہد میں نئی نئی جہتیں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ جستجو کو نئے نئے زاویے ملے نئے نئے خیالات جنم لیتے رہے اور ارتقاء کے عمل میں تیزی آتی چلی گئی اور آج کا انسان تعمیر و ترقی اور علم کی معراج پر پہنچ رہا ہے۔

مستقل حرکت میں رہنے اور مستقل ارتقائی عمل سے گذرنے کے بعد ایک خلیئے یا ایک یک لیے (lamoobae) سے مختلف مدارج طے کر کے انسان اور پھر ایک جدید انسان بننے تک زندگی مستقل حرکت میں رہی تغیرات آتے رہے صرف ایک شے ناقابل تغیر رہی اور وہ ہے حرکت یعنی تغیر کا عمل۔

ع ثبات صرف تغیر کو ہے زمانے میں

ایک خلیئے (cell) سے انسان بننے تک کا ارتقائی عمل دراصل ایک جاندار کی بقاء کی جنگ اور جدوجہد ہے اپنی بقاء کی یہ جنگ انسان سمیت ہر جاندار کی خصلت و جبلت کا حصہ ہوتی ہے لیکن جب کئی انسان اپنی اپنی بقاء کے لئے درپیش مشترکہ خطرات کی وجہ سے ساتھ رہنے پر مجبور ہوئے اور ایک انسان کی جگہ کئی انسانوں کی مشترکہ جدوجہد کا آغاز ہوا تو معاشرے کی بنیاد پڑی سماج بنا اور انسان نے اپنی بقاء کے ساتھ ساتھ خود سے وابستہ انسانوں کی اجتماعی بقاء اور مشترکہ فلاح و بہبود کے لئے سوچنا شروع کیا منصوبے بنائے ادارے تعمیر کئے اور ایک وسیع البنیاد جدوجہد شروع کی گھر بنے، محلے بنے، بستیاں تعمیر ہوئیں، شہر آباد کئے گئے، مملکتیں اور سلطنتیں وجود میں آئیں، تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی رسم و رواج تشکیل دیئے گئے، انسان نے پہلے اپنی بقاء کے سامان سیکھے پھر قدرت اور فطرت کو جاننے کے لئے نت نئے علوم کی بنیاد پڑی الغرض انسانی جدوجہد کا سفر جاری رہا، انسانی فکر کی پرواز جاری رہی۔ انسان کے اس سفر، حرکت اور تغیرات نے انسان کے خمیر میں جستجو پیدا کردی اور بالارادہ شعوری عمل اور تخلیقی محنت و جستجو کی وجہ سے حجابات عالم پر سے پردہ اٹھانے اور قدرت و فطرت کی اصل حقیقت جاننے کے علم "سائنس" کی بنیاد پڑی ـــــ اور پھر سائنس کے فروغ نے ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا آج انسان پتھر کے دور سے نکل کر، غاروں سے نکل کر کمپیوٹرائز معاشرے میں رہ رہا ہے اور اس نے ہائی ٹیک سٹیز (Hightech cities) تعمیر کر لی ہیں۔

ع اہل دل کریں گے تازہ بستیاں آباد

کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے کمپیوٹر انڈسٹری کو جنم دیا، کمپیوٹر انڈسٹری نے انڈسٹریل کمپیوٹر کو اور انڈسٹریل کمپیوٹر نے آنے والے کل کی تمام انڈسٹری کو کمپیوٹر کا محتاج بنا دیا ہے۔ کمپیوٹرائز معاشرے اور سماج کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ کل کی دنیا انسان کو کمپیوٹر جاننے اور کمپیوٹر نہ جاننے والے انسانوں میں تقسیم کر دے گی ـــــ ایک کمپیوٹر بیسیوں افسروں، سیکڑوں کلرکوں، ہزاروں مزدوروں کی جگہ لے لیگا، سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیش گو بتاتے ہیں کہ جنیٹک انجینئرنگ، کلوننگ کے ذریعے معاشرے کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے اور ہر طرح کے معیار پر پورا اترنے والا پرفیکٹ انسان پیدا کیا جا سکے گا۔ کل کمپیوٹر اور جینیٹک انجینئرنگ کے ملاپ سے ملین ڈالر سپرمین اور بایونک دومین Bionec Woman کے تصور حقیقت کی شکل اختیار کر لیں گے کل والدین اپنے ہونے والے بچوں کے میلان طبع رجحانات کا تعین اپنی مرضی سے کر پائیں گے کل ایک اور موجودہ طبعی طریقے سے پیدا شدہ بچے کے سامنے Re-structureGene کے ساتھ پیدا ہونیوالا جینئیس بچہ کھڑا ہوگا کلوننگ کے ذریعے ڈولی شیپ کے وجود سے سب آگاہ ہیں لیکن آج کا انسان ہو بہو ایک طرح کے کئی انسان بنانے پر قادر ہو چکا ہے ـــــ اسٹیم سیل تھراپی، پلانٹ ٹیشو ٹیکنالوجی کے ذریعے انسانی اعضاء کے بینک کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ اب دل و دماغ و جگر بازار میں بکیں گے حسین چہرے خاک میں مل بھی گئے تو ان کے ہو بہو ایک جیسے کئی کئی چہرے دکانوں میں سجے ہونگے، ڈیجیٹل آنکھ بن گئی ہے۔ انسانی آنکھوں میں

کمپیوٹر اور کیمرے نصب کرنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ ایسی گندم اگائی جا رہی ہے جس میں کئی امراض کی ویکسین شامل ہوگی۔ غذا میں ہونے والی تبدیلیاں غذا کو ہی دوا کا درجہ بھی دے دیں گی۔ فنکشنل فوڈ کا عہد شروع ہو رہا ہے۔ کل دریاؤں و سمندر میں تیرنے والا انسان آج خلاؤں میں تیر رہا ہے۔ خلاؤں کو پار کر رہا ہے۔ پچھلی صدی چاند کی تسخیر کی صدی تھی آج کا انسان کائنات میں موجود دیگر سیاروں میں زندگی تلاش کر رہا ہے اب لوگ اخبارات خریدنے کے بجائے اس کو انٹرنیٹ پر پڑھ رہے ہیں کل شاید کاغذی اخبارات کا وجود ہی نہ ہو۔ ای بک E-Book کا عہد شروع ہو چکا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی رفتار اور ہمہ جہت تقاضوں کے باعث ایک کمپیوٹر پر ہر طرح کی لاکھوں کتابیں موجود ہوں گی اور شاید آنے والے دور میں لائبریریاں آثار قدیمہ بن جائیں۔ تعلیم کے لئے درس گاہوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی گھر میں موجود کمپیوٹر درس بھی ہوگا اور درس گاہ بھی۔ یہی تعلیم ہوگی اور یہی معلم۔ مکمل ترین لیکن انتہائی مختصر حجم کے کمپیوٹروں کی وجہ سے پورا دفتر ایک انسان کی کلائی میں ہوگا۔ حکومت اور نجی دفاتر میں فائل ورک کا تصور ختم ہو جائیگا۔ پچھلی صدی میں جین پر ریسرچ کا عمل شروع ہوا تھا اس صدی میں ہر انسان خود اپنی جین کا مطالعہ کر سکے گا انسان اپنے سے طاقتور، تیز رفتار اور ذہین روبوٹ بنا رہا ہے...... Fusion Reaction کے تجربے کی کامیابی کے بعد پانی توانائی کے حصول کا کام دے گا اور دنیا میں توانائی حاصل کرنے کا سب بڑا ذریعہ ہوگا آئندہ پچاس برس بعد تیل ایندھن کے بجائے کیمیائی مرکبات بنانے کے کام آئے گا۔ آج کا جدید اپ گریڈ کمپیوٹر جام جم کی عملی تفسیر بن گیا ہے۔ آج ترقی کی رفتار جمع نہیں بلکہ ضرب، کئی گنا ہو رہی ہے کہا جاتا ہے کہ آنے والے دس سالوں میں اب تک کی دنیا کا سارا علم دوگنا ہو جائے گا۔

اس نوری سال اور نوری رفتار معاشرے میں انسان کی سوچ اور عمل دونوں ہی کمپیوٹرائز ہو جائیں گے آج آواز کی رفتار سے زیادہ تیز سفر کرنے والے انسان کا دماغ کل انفارمیشن ٹیکنالوجی کی سپرہائی وے پر روشنی کی رفتار سے دوڑے گا اور کمپیوٹر کے ساتھ دوڑتا ہوا انسان، انسان کیا ہوگا بس ایک چلتا پھرتا بلکہ دوڑتا بھاگتا کمپیوٹر ہوگا اور مشینی کمپیوٹروں اور انسانی کمپیوٹر کے اس جنگل میں انسان کی انفرادی شناخت نہ صرف مشکل ہو جائے گی بلکہ مٹ کر رہ جائے گی۔ اس نئی صورت حال میں ترقی کی رفتار اپنے ساتھ ساتھ بہت ساری چیزوں کو بہا کر لے جائے گی اقدار و انداز، تہذیب و تمدن، اخلاق و اطوار، معیار و مقاصد اس سیماب صفت نور رفتار ترقی کی زد میں آ جائیں گے۔ غرض یہ کہ انسان کی موجودہ ذہنی اور فکری استعداد اور اس کے تحیر و تخیل کی پرواز کو بروئے کار لانے کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ٹائم اور اسپیس Time& Space کے ہمارے تصورات میں کس قدر حیرت انگیز تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔ آج کوئی صحیح طریقے سے یہ نہیں بتا سکتا کہ مستقبل کی صورت گری کیا ہوگی۔ آج کی جدید سائنس کے تحقیق کار، مفکر اور ناخدا بھی حیران ہیں کہ کل کی دنیا کیا ہوگی۔

ع محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

موجودہ دنیا جو کہ ایک مکمل اور مجسم حیرت کدہ ہے، اس کا مجسم تجسس کناں انسانوں کی تجسس کے مرہون منت ہے۔ آج کے جدید انسان و اقوام جو ٹیکنالوجی کے خالق ہیں، جو علوم کے مالک ہیں، جو قدرت کے ہر راز کی حقیقت جاننے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں جو حقیقت پسندانہ عملیت پر یقین رکھتے ہیں، آج سائنس کا "جن" ان کے قبضے میں ہے اور سائنس کا یہ "جن" اپنے آقا یعنی ان ترقی یافتہ قوموں کی خواہش کو پورا کرنے ان کے خوابوں کو تعبیر دینے اور ان کی ہر سوچ کو عمل کی شکل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آج ایک کے بعد ایک کر کے قدرت کے رازوں کے افشاء ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ انسان فطرت اور قدرت کی حقیقت کے قریب سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کی سوچ اور اس پر عمل کے درمیان حائل فاصلہ وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جا رہا ہے۔ انسانی خوابوں کی تعبیر کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں، انسانی فکر کی بلندیوں اور اس پر عمل کی صلاحیت کے درمیان کا فاصلہ سمٹ رہا ہے۔ کل جو انسان سوچے گا سائنس کی ترقی وہ کر دکھائے گی۔ آج تمام ترقی یافتہ قوموں کی پہلی ترجیح سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔ آج ان کی سیاست کا محور بھی یہی ہے اور ان کی معیشت کی بنیاد بھی۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی ان کی معاشرت کی اٹھان بھی ہے اور ان کی طاقت اور پہچان بھی...... آج یہی لاٹھی ہے اور یہی بھینس...... اب ترقی یافتہ لوگوں اور قوموں کو غیر ترقی یافتہ لوگوں اور

قوموں کو تباہ کرنے معدوم اور ان کی شناخت ختم کرنے کیلئے کسی سازش کی ضرورت نہیں ہوگی اور تیز رفتار ترقی ۔ ترقی یافتہ قوموں اور اپنی ترقی اور تعمیر سے بیگانہ غیر ترقی یافتہ قوموں کے درمیان پہلے سے موجود فاصلہ اتنا بڑھا دے گی کہ وہ پسماندہ قومیں ان ترقی یافتہ قوموں کی برابری کا خواب بھی دیکھنا بند کر دینگی۔ جستجو، توسط اور حرکت کے خاتمے کی وجہ سے پسماندہ قوموں اور نسلوں کے مٹنے کا عمل شروع ہو جائے گا اور وسائل اس طرح بیدار قوموں کے پاس ہونگے کہ اپنی مستی میں مگن جہالت میں ڈوبی کالا من کالا وحن قومیں خود بخود ختم ہوتی جائیں گی۔ اب ان جدید اقوام کی تمام پالیسیوں اور اسٹریٹجی کا دارومدار سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ پر ہے۔ آج ترقی یافتہ قوموں کی خارجہ پالیسی کا ستون بھی سائنس اور ٹیکنالوجی ہے اور داخلہ امور کی بنیاد بھی۔ آج ترقی یافتہ قوموں کی باہمی دلچسپی کا موضوع بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کا فروغ ہے اور باہمی تعلق کی بنیاد بھی۔ آج زر مبادلہ سے زیادہ اہم ٹیکنالوجی کا باہم تبادلہ ہے۔ آج امپورٹ ایکسپورٹ پالیسی سے زیادہ اہم ٹیکنالوجی کی ٹرانسفر پالیسی ہے ۔۔۔ غرض سائنس اور ٹیکنالوجی، کل کی دنیا کی کرنسی بھی ہوگی اور باونڈری بھی ۔۔۔۔ کل سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم کا پھیلاو سرحدوں کا پابند نہیں ہوگا، حکومتی پالیسیوں کے تابع نہیں ہوگا، کوئی کوٹہ، کوئی سسٹم اس کو محدود نہیں کر سکے گا، اس پر بند نہیں باندھ سکے گا، کل علم کے کسی طالب کو حصول علم سے کوئی نہیں روک پائیگا۔ کل کا نظام بھی یہی ہوگا اور آئین بھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم کا پھیلاو اور فروغ مستقبل میں یونی پولر ورلڈ اور ورلڈ گورنمنٹ جیسے تصورات کو جنم دیگا۔۔۔ غرض یہ کہ جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیڈر ہونگے وہی دنیا کے لیڈر ہونگے۔ جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہر ہونگے وہی اس دنیا کے تمام طاقت و وسائل کے مالک ہونگے۔۔۔ تمام نظاموں اور ازموں کی جگہ سائنس ازم چلے گا، ٹیکنالوجی ازم چلے گا یعنی حقیقت جاننے، حقیقت تسلیم کرنے کا حقیقت پسندانہ نظام یعنی حقیقت پسندی Realism اور حقیقت کے جاننے اور تسلیم کرنے کے بعد اس پہ عمل کرنے کا نظام یعنی عملیت پسندی Practicalism ۔۔۔ حقیقت پسندی اور عملیت پسندی ۔۔۔ جو قومیں اس نظام کو اپنائیں گی وہی زندہ رہینگی، وہی بچ پائینگی، وہی حکمرانی کرینگی۔ جو اس پر عمل نہیں کرینگی ماضی کی تہہ میں چلی جائینگی اور تاریخ کے صفحات سے مٹ جائینگی۔ زندگی کے ہر شعبے میں نئی ایجادات و اختراعات، اور نئے نظریات کی پیدائش، فراغ اور ارتقاء اسی نظام کی بدولت ہے۔ اسی نظام کے ذریعے نئی صدی میں عقل اور مذہب کی جنگ اپنے آخری انجام کو پہنچے گی۔ آج کسی نظام کی بنیاد معاشی استحکام ہے تو کسی نظام کی بنیاد معاشی مساوات۔ کوئی نظام کسی خطے کے مفاد کو سامنے رکھ کر بنایا گیا تو کوئی نظام کسی خاص دور کی ضرورت مد نظر رکھ کر تیار کیا گیا کوئی نظام سیاست کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا تو کوئی نظام حکمران طبقے، حکمران اقوام کی مفادات کی خاطر بنایا گیا لیکن حقیقت پسندی (Realism) اور عملیت پسندی (Practicalism) کی بنیاد معیشت، معاشرت، کوئی خاص خطہ یا کوئی دور نہیں بلکہ اس کی بنیاد سائنس ہے یعنی حقیقت کھوجنے جاننے اور ماننے کا نظام ۔ تلاش کی گئی حقیقت پر عمل کرنے کا نظام ۔۔۔ جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ فکر کی تشکیل اسی نظام کے بدولت ہوگی اسی نظام کے بدولت قومی و انفرادی شناخت کو بھی برقرار رکھا جا سکے گا۔ اسی نظام کے ماتحت کل کی دنیا آباد اور برقرار رہے گی ۔۔۔ یہی سچائی ہے اور یہی سچائی تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ اب اس سچائی تک پہنچنے کے لئے ایک بڑے وسیع تر اجتماعی ارادے کی ضرورت ہے۔ حقیقت پسندی اور عملیت پسندی کا یہ نظام دراصل ہر عہد کے ہر طرح کے تقاضوں کے ساتھ خود بخود ہم آہنگ ہونے اور اجتہادی رویہ پیدا کرنے کی فکری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ پوری بنی نوع انسان کی اجتماعی بقاء کی مشترکہ جدوجہد کا نظام ہے یہ حجابات عالم سے پردہ اٹھانے کے طریقہ کار کا نظام ہے۔ یہ انسانی جدوجہد کے سفر اور انسانی فکر کی پرواز کو جاری رکھنے کا نظام ہے، یہی نظام زمین پر جنت کے تصور کی حقیقی تفسیر ہو سکتا ہے۔

حقیقت جاننے، تلاش کرنے اس کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کی سعی کرنا انسان کی فطرت بھی ہے اور جبلت بھی اور شاید انسان کے وجود کی وجہ بھی۔ یہی عمل ذہنی ارتقاء کا باعث ہوتا ہے اور ذہن انسانی کا ارتقاء خدا کی جانب سفر کا نام ہے فطرت و قدرت و کائنات کی اصل حقیقت کو جاننا تلاش کرنا، تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا دین فطرت ہے لہذا حقیقت پسندی Realism اور عملیت پسندی Practicalism کا دو جہتی Two Pronged نظام ہی دراصل نظام فطرت ہے۔ یہی کل کی دنیا کا واحد نظام ہوگا۔

ہم گنہگار ہیں

— ثانیہ ارشد —

ہم گنہگار ہیں
میرے قائد ہم تیرے گنہگار ہیں
ہم نے قلموں میں تیرے قصیدے کہے
تجھ پہ غزلیں کہیں تجھ پہ قطعے کہے
اپنی چاہت کو ہم نے سمندر کہا
تیری گلیوں میں دل کے جریدے کہے
جن کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں
ہم نے تیری جبیں پہ وہ دعوے کہے
جو تصور کے لشکر میں لڑتے رہے

ہم وہ سالار ہیں
میرے قائد ہم تیرے گنہگار ہیں
جاگتی آنکھ سے خواب دیکھے انہیں
اپنی مرضی کی تعبیر دیتے رہے
ہم تیرے بارور موسموں کے لئے
یہ سحر عمر بھر تصویر دیتے رہے
ہم اندھیرے مقدر کو روشن دنوں کی
امیدوں سے تنویر دیتے رہے
تیرے ساحل کی آزادیوں کے لئے
ہم تلاطم کو زنجیر دیتے رہے
جو ہمیشہ تجھے آرزو کے قطروں سے لکھتے رہے
ہم وہ فنکار ہیں
میرے قائد ہم تیرے گنہگار ہیں
ہم تیرے دکھ سمندر سے غافل رہے
تیرے چہرے کی رونق دھواں ہو گئی
ہم امیں جو بیت تھم دل رہے
ظلم کے روبرو ہم نے تیری طرح جب کشائی نہ کی
اس طرح ظالموں میں بھی شامل رہے
حشر آور دنوں میں جو سوتے رہے
ہم وہ بیدار ہیں
میرے قائد ہم تیرے گنہگار ہیں
جب بھی تجھ کو شگفتہ شفق کی ضرورت پڑی
ہم نے دیتا لہو آزمایا نہیں
تیری خوشبو سکوں کی تلاش لئے
آندھیوں کے جلو میں بھٹکتی رہی

ہم نے روکا نہیں
تیری آنکھیں امیدوں کے بادل لئے
خشک موسم کے رستوں کو تکتی رہیں
ہم نے دل کو سمندر بنایا نہیں
تیری عظمت حرمت پہ اور شان میں
اس زمانے نے گستاخیاں بھی کریں
ہم نے کانوں سے سیسہ اتارا نہیں
ہم گنہگار ہیں
میرے قائد تجھے سب علم ہے
لوگ کیوں گرد راہ ملامت ہوئے
جن محافظ تمام دشمنوں کے علم
تجھ سے سیکھے ہوئے تیرے باہم ہوئے
ہم بھی اس کی سیاست کی تصویر ہیں
آشتیوں کے جو سانپ ثابت ہوئے
ہم بھی تیری طرح سازشوں کی ہوا کے
گرفتار ہیں
ہم گنہگار ہیں
ہم گنہگار ہیں میرے قائد مگر
اب قسم ہم کو اپنے اجداد کی
تیری چاہت کی الفت کی اور ساتھ کی
یہ قسم ہے ہمیں آنے والے دنوں کی
اور آنکھوں میں بہتی ہوئی یاد کی
اب محافظ تمام دشمنوں کے علم
ان کے کالے لہو سے بھگوئیں گے ہم
تجھ پہ اٹھتی ہوئی انگلیوں کے نشاں
آنسوؤں کے سمندر سے دھوئیں گے ہم
آخری سر تیرا ہے مستانہ خطر
آج اپنے گناہوں پہ روئیں گے ہم
تیری آنکھوں میں اب میرے قائد کسی
بے وفا کے لئے آنسو آئیں گے
گر کسی نے تیرے ساتھ دھوکا کیا
تو وہ کوئی بھی ہو
اس کے رستے میں دیوار بن جائیں گے
جان دے کر تیرا ہم کر جائیں گے

ہے یقیں تری رہبری و رہنمائی پہ

عبادالرحمن

آج کہ جب ہم اپنے تحریکی سفر کی ربع صدی اور قائد تحریک الطاف حسین اپنی مشعلِ راہ زندگی کی نصف صدی مکمل کر چکے ہیں مجھے اس ذمے داری سے نوازا گیا ہے کہ میں اپنے قائد اور ان کی لازوال قیادت کے حوالے سے چند الفاظ احاطۂ تحریر میں لاؤں۔ جہاں ایک جانب یہ میرے لئے کی اعزاز کی بات تھی وہیں کشمکش وپیچ کا باعث بھی کہ اپنی بات کا آغاز کروں تو کہاں سے؟ اور انجام ہو تو کہاں؟

انسانی ذہن جو خیالات کی آماجگاہ بھی ہے اور تصورات کی پناہ گاہ بھی، جہاں لاکھوں کروڑوں خوبصورت الفاظ لغت کی طرح ثبت تو ہوتے ہیں مگر قائد تحریک الطاف حسین جیسی شخصیت کا تصور نظروں کے سامنے آتے ہی یہ الفاظوں کے پہاڑ ریت کے ٹیلے کی مانند ڈھے جاتے ہیں۔ بالآخر انتہائی سوچ و بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک انقلابی قائد کے ایک نظریاتی کارکن کے لئے سب سے آسان بات یہی ہے کہ وہ اپنی تمام تر تخلیقی اساس، فکری شعور اور نظریاتی جدوجہد کو ایک نکتہ پر مرکوز کردے اور وہ ہے "قیادت پر مکمل یقین" اور اس کے ساتھ ہی میرے خیالات میں تسلسل بھی پیدا ہوگیا اور الفاظ میں ایک نظم بھی۔

ساتھیو! قوموں کی زندگی میں وہ لمحہ ضرور آتا ہے جب انہیں یہ احساس ہوجاتا ہے کہ ان کے زاویۂ نگاہ اور راہ منزل کی درستگی کے لئے کسی ایسی شخصیت اور قیادت کی ضرورت ہے جو مصنوعی اور تیار کردہ نہ ہو بلکہ خداداد صلاحیتوں کی مالک اور ارفع خیالات کی حامل ہو۔ جو قومیں خوش قسمت ہوتی ہیں انہیں نہ صرف ایسی قیادت میسر بھی آتی ہے بلکہ وہ قومیں اپنے اس قائد کی پیروی میں قربانیوں کی آخری حدوود کو بھی چھو لیتی ہیں اور تب قوم اور قیادت کے اس باہمی تعلق سے ایک بہت ہی خوبصورت جذبہ تخلیق پاتا ہے جسے ہم "وفا" کے نام سے جانتے ہیں اور اس وفا کا تمام تر دارومدار بھی اسی ایک نکتہ پر مرکوز ہے یعنی "قائد کی رہبری و رہنمائی پہ یقین"

ساتھیو! انسانی تاریخ نے ارتقاء سے اور حاضر تک لاکھوں افراد کے سر پہ قیادت کا تاج رکھا مگر ان میں سے صرف چند ہی ایسے تھے کہ جنہوں نے شخصی و انفرادی مفادات کے حصول کے بجائے عظیم تر اجتماعی کامیابی کے لئے اپنی سوچ، شعور اور نظریے کی ترویج کو مقدم جانا اور یہی وہ اصل اور خداداد صلاحیتوں کے مالک رہنما ہوتے ہیں۔ ایسی قیادت اپنی قوم اور پیروکاروں کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہے اور ان کی ذہنی رو کی سمت درست کرنے کا باعث بنتی ہے۔

ساتھیو! ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہمارا قائد بھی انسانی تاریخ کے ان چند قائدین اور رہنماؤں میں ہے جنہوں نے اپنے نظریے کی ترویج کو مقدم جانا۔ جو ہماری وفا کو "command" کرتا ہے "Demand" نہیں، جو زمین اور جغرافیہ پر حکمرانی کے بجائے ہمارے دلوں اور ذہنوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ جو تیسری دنیا کے ایک پسماندہ ملک کے غریب اور مظلوم عوام کو انسانی عظمت اور برابری کے ان سنہری اصولوں سے آگاہ کرتا ہے جو ہمارے مذہب کا حصہ ہی نہیں بلکہ ترقی یافتہ دنیا میں رائج

قوانین کا حصہ بھی ہیں۔ آج اس قائد کے چاہنے والے لاکھوں پیروکار دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں اور گو وہ جغرافیائی طور پر منقسم ہیں مگر نظریاتی طور پر پوری طرح سے مربوط ہیں اور یوں ایک قوم کا درجہ قرار پاتے ہیں۔

ساتھیو! اس قوم، قائد اور اس کے کارکنان نے اس نظریہ کے فروغ کے لئے آگ اور خون کے دریا عبور کئے اور قربانیوں کی وہ روایات قائم کیں جن کی عہد حاضر ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں بھی کم ہی مثالیں ہیں۔ حالات نے خواہ کتنا ہی جابرانہ طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا مگر نہ تو اس عظیم قائد نے اپنے لازوال نظریہ سے روگردانی کی اور نہ ان کے نظریاتی کارکنان نے اپنے قائد سے کئے ہوئے پیمانِ وفا کو پامال کیا۔ ان نظریاتی کارکنان نے جب ایک بار یہ فیصلہ کرلیا کہ ان کا قائد سوچ، خیالات، افکار "vision" اور دانائی میں ان سے ارفع ہے تو پھر منزل کے حصول کی ذمے داری قائد کے کاندھوں پر ڈال کر صرف اور صرف قائد کی ہدایات پر عمل درآمد ہی کو زندگی کا مقصد بنالیا۔
یہ نظریاتی کارکنان اپنی پیروی کی معراج کو چھونے لگے جب قائد کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے ہی کو اپنے لئے منزل سمجھنے لگے اور اس سفر کو اتنا حسین کرلیا کہ ان کا رواں رواں پکار اٹھا۔

اے رہبرِ کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے ...... اس وقت مجھے بھٹکا دینا جب سامنے منزل آجائے

کسی شاعر کے اس خوبصورت شعر میں ایک نظریاتی کارکن کی اپنے قائد کے لئے "submission" بھی موجود ہے اور منزل پر پہنچنے کا یقین بھی اور ان جذبوں کے ساتھ ساتھ سفر کی طوالت کی خواہش یوں کی جارہی ہے کہ قائد سے پیمانِ وفا برقرار رہے۔

ساتھیو! ہم آج تاریخ کے اس موڑ پر کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ آیا ہم تاریخ کا حصہ بن جائیں یا ایک نئی تاریخ رقم کردیں، ہمیں یہ فیصلہ بھی کرنا ہے کہ ہمارا اپنے قائد اور اس کی رہنمائی پر یقین اپنی انتہائی حدود کو چھو رہا ہے یا اس یقین میں کسی قسم کی کوئی دراڑ پڑ رہی ہے۔ ہمارا اپنے قائد اور اس کی قیادت پر یقین اس قائد کے لئے منزل کا حصول جلد اور تیز تر بنا دے گا مگر ہمارے یقین میں اگر کوئی دراڑ ہے تو وہ اس سفر کو کٹھن اور دشوار کردے گی۔ یاد رکھئے ہمارا قائد اپنی نظریں اپنی حقیقی منزل پر مرکوز کئے ہوئے ہے اور وہ اس منزل پر پہنچ کر ہی دم لے گا ــــ سوچنا ہمیں ہے کہ WITH US OR WITHOUT US

ہمیں قائد کی تقلید ہی نہیں کرنی، تاریخ کی تخلیق بھی کرنی ہے۔
آپکو، ہمیں اور پوری قوم کو قائد کی پچاسویں سالگرہ مبارک ہو۔

(حرفِ اوّل)

مختار آفریں

دورِ حاضر کے مسیحا

دورِ حاضر کے مسیحا
جانِ بلبِ انسانیت کے چارہ گر
اے عہدِ نو کے راہبر
تو نے بخشا ہے انساں کو شعور
کتنے ظالم آمروں سے تو نے چھینا ہے غرور
تیرگیِ وقت سے تو نے لیا ہے انتقام
اے دمکتے آفتاب
وسعتِ صحرا میں تو تشنہ لبوں کے واسطے مثلِ سحاب
تو تمازتِ دھوپ کے ماروں کے حق میں ماہتاب
تیرے دم سے ہے بہارِ زندگی
تجھ سے ہے قول و قرارِ زندگی
تیرے لب کا فسوں
جس میں ہے سوز و دروں
دشت میں بکھرے ہوئے بھٹکے ہوؤں کے
واسطے تیری صدا ہے مثلِ آوازِ جرس
جب تیری آواز کہساروں سے
میدانوں سے
دریاؤں سے ہو کے
لاکھوں سننے والوں کو دیتی ہے
فردا کی نوید
ایک تازہ ولولہ انگیز امید
لوٹ آتی ہے بہارِ زندگی
جگمگا اٹھتا ہے پھر سے رہگزارِ زندگی
تیرے لب کا فسوں
ہے حاصلِ سوزِ دروں
سن کے جس کو ظالموں کے دل
لرز اٹھتے ہیں
اہلِ جبر کانپ اٹھتے ہیں جس کے خوف سے
دورِ حاضر کے مسیحا
جانِ بلبِ انسانیت کے چارہ گر
اے عہدِ نو کے راہبر
تو نے اپنے خوں سے روشن کئے وہ چراغ
وقت کی آندھی جو چاہے بھی بجھا سکتی نہیں
ثبت ہیں جو جہدِ عمل کی راہ میں جو نقشِ پا
ان کو کوئی مٹا سکتا نہیں

کب تجھے معلوم تھا
اک وقت ایسا بھی کبھی آ جائے گا
گھر بھی چھوٹے گا ترا تو دربدر ہو جائے گا
تجھ پہ ٹوٹے ہیں اذیت کے پہاڑ
صبر کا دامن مگر چھوٹا نہیں
تو کبھی بھی لمحۂ کمزور سے گزرا نہیں
تیری جرأت کے مقابل گردشیں حیراں ہیں
جو تجھے آساں سمجھتے ہیں بہت ناداں ہیں
کون تھا تیرے سوا جو دیکھتا
اپنے ہم وطن کی یہ محرومیاں جانکاہیاں بے چارگیاں
چلتے پھرتے زندہ لاشوں کے ہجوم
اور مقابل سر برہنہ وقت کے زہریلے ناگ
ملک کی گندی سیاست کے وہ کاگ
بے ضمیری جن کا فن ہے
اور ذرا تو نے اک جھٹکے میں ہی جن کا بھرم
ہر قدم پر لوٹتے ہیں جو وطن کی آبرو اور بانکپن
جب بدلتے ہیں یہ تیور اس گھڑی لگتی ہے آگ
غربت و افلاس و نفرت کے بھڑک اٹھتے ہیں پھر شعلے یہاں
جشنِ بربادی مناتے ہیں یہ لوگ
راستہ تبدیل کر لیتے ہیں یہ
وعدے جو کرتے ہیں یہ پورے کبھی کرتے نہیں
لفظ جو بھی بولتے ہیں ان کے وہ ہوتے نہیں
خوف و نفرت کے بلند ایواں میں پلتے ہیں یہ
عدل و انصاف ان کے غلام زر خرید
جسم پر پہنے نظر آتے ہیں نیکی کی قبا
بد سے بدتر دامن کے پردے میں رکھتے ہیں روا جور و ستم
سڑک کے موڑ پر ہر اک چوراہے پر
اپنے زعمِ اکثریت اور جھوٹی برتری کے واسطے
چھوڑ دینے والوں کی ہر سو ٹکڑیاں ہیں ٹولیاں
ہیں مقتدر اب بنامِ امن چلتی گولیاں
شہر ہے شہرِ خموشاں، بستیاں ویران گھر بھی گم کسے
غم زدوں کے آنسو ہر طرف بکھرے ہوئے
اور آسماں اوڑھے ہوئے چادر سیاہ
وحشتیں رقصاں یہاں شعلوں کے بیچ
اور ادھر ہیں سنگِ مرمر سے تراشے قصر و ایواں

جن کے کمروں میں کوئی آواز باہر کی کبھی جاتی نہیں
کیا ستم ہے کہ یہ سب اب ہیں اونچی کرسیوں پر جلوہ گر
اور ان کے سامنے
خوش قسمتیں اور خوش گمانی کے نئے جالے کے
نئے منصوبے ہیں
قصر و ایواں سے پرے
آباد سڑکوں پر تلاشِ روزگار اور نان کی خاطر
جوانوں کا ہجوم
گردشِ ایام کے روندے ہوئے کچلے ہوئے لاکھوں غریب
خودکشی کرتے ہوئے بے بس عوام
ایک دو دن کی نہیں برسوں پرانی داستاں کے
بے زباں کردار تھے
ان کی منزل تھی تباہی اور گمراہی کی صورت
کون تھا ان کو حیاتِ نو کا جو دیتا یقیں
دورِ حاضر کے مسیحا
جانِ بلبِ انسانیت کے چارہ گر
اے عہدِ نو کے راہبر
کس میں دم تھا جرأتِ اظہار کر سکتا تھا کون
سر اٹھانے کی سزا تھی قید و زنداں بیڑیاں
حق طلب کرنے کا تھا انعام مرگِ ناگہاں
رات آتی تھی تو چاروں سمت فراخ تھا خوف
نیند آتی تھی تو عکسِ خواب سے آتا تھا خوف
صبح دم سورج جو آتا تھا ابھرتا تھا خوف
سرخیِ خونِ شفق کو دیکھ کر آتا تھا خوف

([illegible])

حرفِ آخر

ایسے عالم میں نیا حوصلہ بخشا تو نے
اپنے ہونے کا ہمیں احساس دلایا تو نے
پستیوں میں پڑے لوگوں کو اٹھایا تو نے
رنگ و نسل کو بھی یہ تفاوت کیسا
ایک انساں پہ انساں کا اجارہ کیسا
بے ضمیروں کی ضمیروں کی حمایت کیسی
ظالم و جابر و قاتل سے رعایت کیسی
ظلمتِ شب کو سدا ظلمتِ شب تو نے کہا
کل جو کہتا تھا وہی آج بھی تو کہتا ہے
دشت میں بادِ حجازوں کا طلب گار ہے تو
جابروں کے لئے کھنچی ہوئی تلوار ہے تو
راہِ پُر خار سے تو بھی تو کبھی گزرا تھا
زخم ہر روز تجھے بھی تو دیے جاتے تھے
روز ہوتا تھا تری جاں پہ عذابوں کا نزول
دیکھتا تھا تو بڑے صبر و کرب کے ساتھ
بے گناہ لوگوں کی تذلیل کے سارے منظر
شبِ زنداں میں سلگتے ہوئے چہروں کی قطار
صبحِ روز روشن کو ترستی ہوئی آنکھوں کا ہجوم
ظلم اور جور کے ماحول میں یہ عزم رہا
مسکراتے ہوئے حالات کا ہر جبر سہا
ایسے عالم میں اک آواز سنی تھی تو نے
مادرِ ارضِ وطن
روحِ زمیں کی آواز
الم و رنج و مصائب کا جو حاصل تھی
جس کی ہر بات میں ممتا کی تڑپ شامل تھی
اپنے بیٹے سے مدد مانگ رہی ہو جیسے
اس کی آواز پہ لبیک کہا تھا تو نے
راہ دشوار تھی کانٹوں سے بھری تھی جس کو
جرأت و عزم سے ہموار کیا تھا تو نے
حکمرانی نے ترے بڑھتے قدم جب چومے
مشتعل ہو کے سیاست کے خداوندوں نے
نت نئے جال بنے
سازشیں دن رات ہوئیں
اور تو

اپنے فرائض کو ادا کرتے ہوئے
روز و شب شام و سحر ہر طرح مصروف رہا
تو نے چاہا تو یہ چاہا تھا فقط
اپنے لوگوں کو ملے آبرو سے داد و مقام
پیٹ کو روٹی ملے جسم کو ملبوس ملے
خشک ہونٹوں پہ نمی تو آئے
ان کے آلام و مصائب میں کمی تو آئے
زرد چہروں پہ مسرت کی رمق لہرائے
تو نے چاہا تو یہ چاہا تھا فقط
زیردستوں کو نئی قوتِ پرواز ملے
جبر مسند زادوں کے چہروں سے
نقابوں کو ہٹاتا چلا
ان کے مکروہ خد و خال کو
آئینہ دکھاتا چلا
تیرا کردار ترا جہدِ عمل
جرمِ بغاوت ٹھہرا
سرِ بازارِ سیاست تری قیمت بھی لگی
تو مگر ذات میں کردار میں انمول تھا انمول رہا
تیری ہستی کا وہ چھوٹا سا سفر
آمرِ عہد کے ایوان پہ ہے
اک قہر کی صورت قائم
جس کی دہلیز پہ وقت آنے پر
سربراہوں کے ہوئے تھے سر خم
آج مقہور سہی بے بس و مجبور سہی دور سہی
میرا ایمان ہے وہ وقت ضرور آئے گا
اپنے حالات کی زنجیر میں جکڑے ہوئے لوگ
سرخرو ہوں گے غمِ دہر کے مارے ہوئے لوگ
حکمرانی کا اٹھائے ہوئے پرچم جس روز
اپنے لوگوں میں تو ہو گا موجود
تیری ہستی کا وہ چھوٹا سا سفر
آمرِ وقت سے منوائے گا پھر اپنا وجود
وہ جو اجڑی تھی کبھی بزم سجے گی پھر سے
جاں نثاروں کی جو محفل تھی سجے گی پھر سے

سارا شہر منصور ہُوا

سیدہ نفیس حسن

جامعہ میں منصور کے داخلے نے مجھے ماضی کے کئی خواب یاد دلا دیے، جن پر ماہ و سال کی نہ جانے کتنی گرد پڑی تھی ----

میرے شوہر نے ہنستے ہوئے کہا تھا لو بھئی شہرہانو ہم تمہاری یونیورسٹی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے اب ہمارے بیٹے کے داخلے سے ہماری یہ خطا تو معاف ہوئی۔ اور منصور خوشی سے میرے گلے لگ گیا۔ اصل بات تو یہ کہ اُسے داخلہ پسندیدہ مضمون میں ملا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ بی ایس سی میں فرسٹ کلاس لانے کے لئے اس نے دن رات ایک کیے تھے کہ کیمسٹری میں داخلہ مشکل سے ملتا ہے۔ آپ ہمیشہ کہتی تھیں کہ جامعہ میں پڑھنا آپ کا خواب تھا۔ اب آپ دیکھیے گا میں آپ کے خوابوں کو کس طرح تعبیر دوں گا ---- تم ایم ایس سی کرلو، سمجھو میں نے سب کچھ پالیا ---- ارے ایم ایس سی پر قناعت نہ کریں، میں تو پی ایچ ڈی کروں گا ---- ماما ظفر کی طرح ---- مجھے معلوم تھا میرا بھائی، ظفر اس کا آئیڈیل ہے۔ میں شوق سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ میرا خوب صورت اور خوبرو بیٹا ---- میرے خوابوں کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر ---- تعبیریں دیر سے ملیں لیکن ملتی ضرور ہیں ---- آج میں ماضی میں بہت پیچھے کی طرف کھڑی ہوں ---- جب میں خود طالب علم تھی ---- ہر چیز سے بے پروا اور صرف پڑھائی میں مگن۔ بی۔اے میں آتے ہی میں نے ایک رٹ لگائی تھی کہ میں یونیورسٹی ضرور جاؤں گی۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری ایک کزن ان دنوں یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں زیرِ تعلیم تھیں ۔میں ان کے ساتھ ایک دفعہ مشاعرے میں اور پھر ایک تقریری مقابلے میں گئی تھی۔

لمبی لمبی راہداریاں ---- کالے گاؤن پہنے لڑکے لڑکیاں ---- لائبریری کی ---- ایک عجیب سی اور میری نظر میں ایک طلسماتی فضا، ان سب چیزوں نے مجھ پر ایک سحر سا کردیا۔ میں جب ابا سے کہتی وہ ہمیشہ کہتے، ہاں بیٹا ضرور تم بی۔اے کرلو پھر یونیورسٹی جانا۔ ظفر اور میں ---- ہم دو بہن بھائی تھے۔ ابا ہمیشہ کہتے، تم دونوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ اس بیچ اماں دھیرے سے کہتیں ---- شادی کی سوچو، کہاں تک پڑھاؤ گے۔ کئی اچھے رشتے ہیں ۔ ہاں بھئی شادی بھی اپنے وقت پر ہوجائے گی ---- لیکن انسان سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے ---- ابھی میں بی۔اے کے آخری سال میں تھی کہ اچانک ہی ابا پر فالج کا ایسا جان لیوا حملہ ہوا کہ چند دن کومے میں رہنے کے بعد، وہ ہم کو تنہا چھوڑ گئے اور یوں اچانک ہی ہم زندگی کی تپتی دھوپ میں آگئے۔ سایہ دار درخت کیا جدا ہوا کہ جیسے دنیا ہی ختم ہوگئی ---- لیکن دنیا ختم کہاں ہوتی ہے ---- اماں نے سال کے اندر ہی ان آئے ہوئے رشتوں میں سے عاصم کے رشتے کا انتخاب اس لئے کر لیا کہ ان سے بہت پُرانے خاندانی مراسم تھے۔ عاصم اور انکی بیمار والدہ ---- دو نفوس کا خاندان تھا اور

یوں زندگی ایک نئی ڈگر پر رواں دواں ہوئی۔ عاصم بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ عاصم کی بیمار والدہ کی خدمت۔۔۔۔ان کے انتقال کے بعد۔۔۔۔ منصور کی ولادت۔۔۔۔ پڑھنے اور پڑھانے کے سارے خواب، خواب ہی رہ گئے۔

شہر کے وسط میں ہمارا فلیٹ تھا اور عاصم کا اپنا پریس بھی، جو فلیٹ سے قریب ہی تھا۔ اس علاقے میں بہت گہما گہمی اور شور رہتا تھا لیکن یہاں رہنے کا اپنا ہی ایک مزہ تھا۔ یہ پرانے بنے ہوئے فلیٹ، جو بہت کشادہ اور آرام دہ تھے۔ کئی دفعہ ہم لوگوں نے سوچا کہ کہیں اور بڑے گھر میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن پریس قریب ہونے کی وجہ سے عاصم دوپہر گھر آجاتے۔ نماز پڑھ کر کھانا کھاتے اور کچھ دیر آرام کرکے پھر پریس چلے جاتے۔ منصور کی یونیورسٹی کا پوائنٹ بھی نزدیک تھا۔ ان سہولتوں نے نئے گھر جانے کے پروگرام کو کئی دفعہ ٹال دیا۔ اور بات یہاں آکر رکی کہ منصور کی شادی ہوئے اور نئے گھر سے کریں گے۔۔۔۔ اور وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ سالِ اول بھی تمام ہوگیا اور فائنل آگیا۔ پچھلے سال کی کارکردگی کی بنا پر منصور کا نام پوزیشن ہولڈرز میں تھا۔ میں ہر لمحہ خدا کی شکر گزار تھی۔

یہ ۱۹۹۰ کے اگست کے مہینے کا آخر تھا۔ ہمیشہ کی طرح گرم۔ صبح جانے کہاں سے کچھ بادل آگئے تھے اور ہلکی سی پھوار بھی پڑی تھی لیکن دوپہر خاصی گرم تھی۔ شہر میں بڑی گہما گہمی تھی۔۔۔۔ بہت دنوں بعد ایسا لگ رہا تھا کہ کراچی جاگ گیا ہے۔ راستے سجے ہوئے تھے۔ استقبالیہ کیمپوں میں بڑی گہما گہمی تھی۔ شہر کے وسط پاکستان چوک کے علاقے میں ہمارے فلیٹ کے نیچے استقبالیہ کیمپ میں تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ جھنڈیاں، لائٹیں ہر چہار جانب بڑی بڑی تصویریں، بے شمار لوگ، ہر طرف زندگی رواں دواں تھی۔ بہت دنوں بعد شہر کے لڑکوں میں جوش، خوشی اور ولولہ ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔ کبھی کیسٹ میں لگے نغموں کی آواز تیز ہوتی، تو کبھی نعروں کی۔ یہ سب قائدِ تحریک کی آمد کی تیاریاں تھیں۔ میں کام کرتے کرتے کئی دفعہ گیلری میں جا کے نیچے جھانکتی، یہ سب زندگی کی علامت ہے۔ سیاسی تغیر و تبدل۔۔۔۔۔

دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ عاصم کھانا کھانے آئے تو کہنے لگے نیچے تو بہت رونق ہے۔ بہت رش ہے۔ راستہ چلنا دشوار ہے آج عاصم کے پریس واپس جانے سے پہلے منصور آگیا۔ ارے بھائی آج آپ کی سواری کیسے جلدی وارد ہوگئی۔ امی آج ایک بجے کے بعد کوئی کلاس نہیں تھی اور میں آج لائبریری بھی نہیں گیا۔ میں اپنے یونٹ کے لڑکوں سے وعدہ کرکے گیا تھا کہ جلدی آکر ان کے کام میں ہاتھ بٹاؤں گا۔ رات بھی تم کافی دیر سے آئے تھے۔ جی۔۔۔۔ ہم کافی رات تک کام کر رہے تھے۔ عاصم پریس چلے گئے۔ میں نے کمرے میں آتے ہوئے کہا کھانا نکالوں۔ ہاں آپ کھانا لگائیں، میں ایک منٹ میں شاور لے کے آتا ہوں۔ نہا کر وہ سیدھا میز پر آگیا۔۔۔۔ امی آپ نے کھایا۔۔۔۔ ہاں تمہارے ابو کے ساتھ کھالیا۔۔۔۔ کھانا کھا کر وہ سیدھا میرے کمرے میں آگیا۔ کیا پڑھ رہی ہیں۔۔۔۔ واہ شاعری۔۔۔۔ ناصر کاظمی کی کتاب لگ رہی ہے۔ ہاں۔۔۔۔ آپ پھر یہ آج کا اخبار مجھے دیدیں۔ وہ میرے برابر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کتاب بند کرکے اس کی جانب دیکھا، وہ اخبار پڑھتے پڑھتے بے خبر سو گیا۔۔۔۔ وہ عام طور پر دوپہر میں نہیں سوتا تھا۔ لیکن رات بہت دیر سے سونے کے سبب سو گیا۔ گیلے بال۔۔۔۔ بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔ اور جانے میں کب سو گئی۔۔۔۔ ہم کتنی دیر سوئے۔۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔۔ چند لمحے۔۔۔۔ چند گھڑیاں۔۔۔۔ کہ صدیاں گزر گئیں۔۔۔۔ نصیب سو گئے۔۔۔۔ ایک دم شور ہوا، دھڑا دھڑ تیزی سے بہت سے لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے۔۔۔۔ منصور کو گولی لگ گئی۔۔۔۔ کیمپ میں فائرنگ ہوگئی۔ پتہ نہیں کون لوگ گاڑیوں میں

آئے اور گولیاں چلاتے ہوئے بھاگ گئے۔۔۔۔ منصور کو گولی لگ گئی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ منصور تو سو رہا ہے دیکھو۔۔۔۔ یہ میرے قریب۔ یہ دیکھو میں نے اس کے تکیے پہ ہاتھ پھیرا۔۔۔۔ یہ دیکھو تکیہ ابھی گیلا ہے۔ وہ ابھی نہا کر لیٹا تھا۔۔۔۔ وہ یہاں ہی ہے۔۔۔۔ نہیں باجی۔۔۔۔ منصور کو گولی لگ گئی۔۔۔۔ نہیں آپا۔۔۔۔ منصور۔۔۔۔۔ نہیں آنٹی۔۔۔۔ آوازیں۔۔۔۔۔ اس کو اسپتال لے کے گئے ہیں۔ میں پھٹی آنکھوں سے سب کو تک رہی تھی۔۔۔۔ لمحہ لمحہ گھور رہا تھا۔ مجھے وہاں لے چلو، جہاں منصور کو لے کر گئے ہیں۔ میں کمزور آواز میں کہہ رہی تھی۔ میرا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔۔۔۔ عاصم۔ عاصم تم کب آئے۔ دیکھو یہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا اللہ مجھ سے ایسا امتحان نہیں لے سکتا۔۔۔۔ دیکھو وہ ابھی یہاں کھڑا تم سے باتیں کر رہا تھا۔ عاصم وہ میرے پاس تھا۔ میں اب بھی اس کا لمس محسوس کر رہی ہوں۔۔۔۔ نہیں وہ کیسے جاسکتا ہے۔۔۔۔

وہ تو میرا جیتا جاگتا خواب ہے۔۔۔۔۔۔
کیا سارے خواب راکھ ہوگئے۔۔۔۔۔۔۔
منصور۔۔۔۔۔۔۔ منصور۔۔۔۔۔۔۔۔۔

رنج کروگے کتنے
سارا شہر منصور ہوا

کتنے دن گزر گئے۔۔۔۔ کتنے سال بیت گئے۔۔۔۔ قلم تو آج بھی خوں رو رہا ہے۔۔۔۔ بہت سالوں بعد منصور تمہارا نام لکھا تو پتہ چلا کہ خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھے والے لفظ زندہ ہیں، کیوں کہ خون تو کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ میرے دل اور آنگن دونوں سونے ہوئے۔۔۔۔ میرے خواب راکھ میں تبدیل ہوئے۔۔۔۔

لیکن یہ راکھ گلاب بنے گی
یہ راکھ گلاب ہو گی

حُسنِ آگہی

عبادت حسین طارق

گلشن میں ہے، نہ بن میں، نہ دشت و دمن میں ہے
تیرا خیال آج بھی تیرے وطن میں ہے

یہ کون ہو رہا ہے سرِ انجمن طلوع
اک چاندنی سی آج میری انجمن میں ہے

حیرت سے دیکھتے ہیں تیری سمت اہلِ ہوش
وہ حسنِ آگہی تیرے دیوانہ پن میں ہے

یہ کس ہوا نے پھونک کے رکھ دی چمن میں آگ
شعلہ سا اک قبائے گل و یاسمن میں ہے

ہنستے ہیں کج کلاہ تیرے احرام کو
قائم وہ آن بان تیرے سادہ پن میں ہے

الطاف حُسین نے کیا کیا؟

روحیل خان

قسط اوّل

۱۱ جون ۱۹۷۸ سے آج تک، زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی قوم اور مقصد کے حصول کیلئے وقف کردینے والے، الطاف حُسین کے کاموں کو کسی ایک مضمون میں بیان کرنے کی کوشش، کوتاہی فکرو نظر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ موضوع ہے جس کا محض اجمالی بیان ہی ایک ضخیم کتاب کا تقاضہ کرتا ہے، جبکہ یہاں انتہائی محدود صفحات پر مشتمل مضمون نویسی درپیش ہے۔ لہٰذہ مختصر کو اختصار دیتے ہوئے، قائد تحریک جناب الطاف حُسین کے بے شمار کارناموں میں سے چند، آپکی پیشِ نظر ہیں۔

فقیدالمثال راست گوئی: الطاف حُسین کی ولولہ انگیز اور معتبر شخصیت کا سب سے پہلا اور منفرد رنگ، خودا کے دورِ جوانی اور تحریک کے ابتدائی مرحلے میں سامنے آیا۔ تاریخ اِنسانی نے پہلی بار ایسا ہوتے دیکھا کہ ایک شخص لوگوں کو اپنے پاس بلا رہا ہے، اپنے گرد جمع کر رہا ہے اور پھر اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہا ہے۔۔۔۔۔ اس اعلان کے ساتھ کہ نقصان کا سودا ہے۔۔۔۔ جو نقصان اٹھانے کیلئے تیار ہو وہ میرے ساتھ چلے۔ اور جو ساتھ چلے وہ صِلے کی توقع نہ رکھے۔۔۔۔ کہ میری راہ میں، پھُول نہیں کانٹے ہیں۔

یہ کون ہے؟۔۔۔۔ یہ کون ہے کہ نقصان کا اعلان کرکے بھی توقع کرتا ہے کہ کوئی ساتھ دیگا۔۔۔۔ یہ کون ہے؟۔۔۔ کہ خود کہتا ہے کہ ساتھ دو تو صِلے کی توقع کے بغیر۔۔۔۔ یہ کون ہے کہ پیروی کرنے والوں کو سبزباغ نہیں بلکہ اپنی راہ کے کانٹے دکھاتا ہے۔۔۔

صِلے سے بےنیاز اور انجام سے بے فکر، اِس ازلی حق پرست کا نام ہے الطاف حُسین۔۔۔۔

خود اعتمادی، قوتِ ارادی، حق پرستی، راست گوئی اور معاملہ فہمی، الطاف حُسین کی شخصیت کے وہ عناصرِ خمسہ ہیں، جنھوں نے الطاف حُسین سے نہ صرف انکے ہمسفروں کے ذاتی نقصان کا کھُلا اعلان کروایا بلکہ اِس اعلان کے باوجود ہمسفروں کا ایک سمندر بھی فراہم کردیا۔

اِنسانی تاریخ میں الطاف حُسین کی یہ راست گوئی اور خود اعتمادی، وہ مقام پائیدار ہے کہ نسلِ اِنسانی اِس سے صدیوں سبق لیگی اور فیضیاب ہوگی۔

شیعہ سنی فساد کا خاتمہ: چودہ سو سال سے جاری ایک اِسلامی بیماری، یعنی مُسلمانوں کا ایکدوسرے کے خلاف

کفر کے فتوے جاری کرنا اور پھر خود اپنے ہی جاری کردہ فتوں کو فرمانِ الٰہی کا درجہ دیدینا، ایک ایسا ناقابلِ تلافی اور شرمناک نقصان رہا ہے کہ اگر نہ ہوتا تو شاید آج مسلمان ساری دُنیا کے محکوم ہونے کی جا حاکم ہوتے۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اِسلام کو قرآن یا عالمِ قرآن سے نہیں، بلکہ مُلا سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اِسلام کی پہچان، خود بات کرنیوالے کا استدلال نہیں بلکہ اس کا حلیہ قرار پایا۔ ایک خاص وضع اور لب و لہجہ اختیار کرنیوالا ہر شخص، صبح سے شام تک مُلا بننے میں کامیاب ہوگیا، اور اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ رہی کہ وہ قابلِ اعتبار تھا یا نہیں مگر اپنی اِک خاص وضع کی وجہ سے معتبر ٹھہرا۔

یہی معتبر مُلا حضرات جب میدانِ عمل میں اُترے تو اِن کا دامن علم اور فکر سے خالی تھا۔ اِسلام کے بنیادی موضوعات اور کاموں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اِنھوں نے اپنے لیئے آسان کام کا اِنتخاب کیا۔ آسان کام دُشمنوں کو دوست بنانا نہیں بلکہ دوستوں کو ایکدوسرے کا دُشمن بنادینا ہے، بھائی کو بھائی سے لڑا دینا ہے۔ چودہ سو سالوں میں مُلاؤں نے ایکدوسرے سے لڑنے اور لڑوانے کے سوا کچھ نہ کیا۔

اِسلامی تاریخ کی یہ شرمناک حقیقت سفر کرتے کرتے سندھ کے شہری علاقوں میں بھی آ پہنچی۔ یہاں بھی ہمیں کافر قرار دینے اور اپنے ہی بھائیوں سے لڑانے والے، بڑے بڑے مشائق و بزرگ مند مولانا حضرات دونوں جانبوں سے میدان میں اُترے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ کے شہری علاقے بُری طرح شیعہ سنی فسادات کی لپیٹ میں آگئے، مگر کبھی سنی مُلا کو اپنے شیعہ بھائیوں کی بدترین ہلاکتوں پر برائے نام افسوس بھی نہ ہوا۔ اِسی طرح کسی شیعہ مُلا نے سنی کی موت کو انسان کی موت نہ سمجھا۔

اِس صورتِ حال میں خود فریبی نے زبردست غلبہ پایا اور یہ دکھایا کہ کوئی اپنا جان سے گیا تو شہید اور پرایا گیا تو حالتِ کفر لازم آئی۔

۱۹۸۶ء میں سندھ کے شہری علاقوں پر رحمتِ الٰہی کا کھلا نزول ہوا اور جناب الطاف حُسین کی قیادتِ پُرسعادت سامنے آئی۔ اُن کی آن میں نہ تو سنی شیعوں کے لیئے کافر رہے اور نہ ہی شیعہ سنیوں کے لیئے۔ قیادت کے تدبّر اور نیک نیتی نے صحیح راہ دکھائی اور لایعنی عداوت کی آگ بُجھائی۔ یہ خوش نصیبی شاید اِسلامی تاریخ کا مقدر کبھی نہ رہی ہو کہ وہ شیعہ و سنی، جو چودہ سو سال سے، کبھی نہ کسی شکل میں، ایکدوسرے کو نقصان پہنچاتے چلے آئے ہیں، آج سندھ کے شہری علاقوں میں، اُنکے قُرب اور باہمی اتحاد و ایثار کا یہ عالم ہے کہ خطۂ ارض پر نظیر نہیں ملتی۔ آج سندھ کے شہری علاقوں میں موجود شیعہ سنی اُخوت اور بھائی چارہ، سارے عالمِ اِسلام کے لیئے مرکزِ نگاہ اور باعثِ فخر ہونا چاہیئے۔

جناب الطاف حُسین کے اِس عظیم کارنامے کا نظر انداز کیا جانا، نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالمِ اِسلام کے لیئے ناقابلِ بیان خسارہ ہوگا۔ جس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے یا سیاسی رقابت نہ آنے دے، وہ منہ مانگے دام لے اور اتنے دیرینہ اور حساس موضوع پر اِنسانوں کے قلوب کو اِس درجہ بدل کے دکھادے جس درجہ جناب الطاف حُسین نے سندھ کے شہری علاقوں میں بدلا ہے۔

(الطاف حسین نے دیا تھا)

جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ : جی ہاں ! یہ عنوان آپ کو بڑا عجیب لگ رہا ہوگا، کیوں کہ بظاہر جاگیردارانہ نظام آج بھی پاکستان بھر میں پوری طرح قائم ہے، جبکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ پاکستان کا جاگیردارانہ نظام، جناب الطاف حسین کے ہاتھوں خاک میں مل چکا ہے۔ اس نظام کو جناب الطاف حسین ختم کرچکے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دھوکہ دیتے ہیں یہ بازیگر کھلا

ذرا سوچیئے کہ اگر ایک درخت کو جڑ سمیت زمین سے نکال کے آپ کے سامنے ڈالدیا جائے، تو آپ اس درخت کو کیا کہیں گے۔ یقیناً آپ اس درخت کو کوئی اور نام تو نہیں دیںگے، درخت ہی کہیں گے۔۔۔۔ لیکن کیا یہ درخت مزید پروان چڑھ سکے گا۔۔۔ ہرگز نہیں۔

آج پاکستان کا جاگیردارانہ نظام، جناب الطاف حسین کی پچیس سالہ جدوجہد کے نتیجے میں، ایک ایسے درخت کی حیثیت رکھتا ہے جسے جڑ سمیت زمین سے نکال دیا گیا ہو۔ آج بھی، پہلے کی طرح، یہ نظام، جاگیردارانہ نظام تو کہلاتا ہے، لیکن آج اس جاگیردارانہ نظام کے خلاف خود اس نظام کے مولودہ و پروردہ، سیاستدانوں اور دانشوروں کی گھٹی گھٹی آوازیں ضرور سنائی دیتی ہیں۔ جناب الطاف حسین کی فلک شگاف آواز کے مقابل، جاگیردارانہ نظام کے پروردہ سیاستدانوں اور دانشوروں کی یہ گھٹی گھٹی اور دبی دبی آوازیں، دراصل اس بات کا اعلان ہیں کہ جناب الطاف حسین جاگیردارانہ نظام کو مٹانے میں کامیاب ہوچکے ہیں۔

ان سیاستدانوں اور دانشوروں کی آوازوں میں آج یہ گھٹن اس لیئے ہے کہ ابھی یہ بات پوری طرح ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ جاگیردارانہ نظام کا یہ درخت، مزید پروان نہیں چڑھ سکے گا اور نہ ہی اپنی موجودہ شکل میں برقرار رہ سکے گا۔ جس دن یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی، ساری دنیا جاگیردارانہ نظام کے خلاف اٹھنے والے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھے گی۔ آج کا مؤرخ، کل کے لیئے لکھ لے کہ جناب الطاف حسین کے اس کارنامے کو، یہ ابن الوقت سیاستدان اور دانشور ایکدوسرے سے نبردآزما ہوتے ہوئے اپنے اپنے دامن میں سمیٹنے اور ہر طرح کا اعزاز پانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن کیوں کہ یہ لوگ نظریاتی طور پر جاگیردارانہ نظام کے خاتمے پر یقین نہیں رکھتے، اس لیئے یہ لوگ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ بھی جاگیردارانہ انداز میں چاہیں گے۔ یہ لوگ اس نظام کے کچھ اعضاء کو بچانے کی بھرپور کوشش کریں گے، مگر جناب الطاف حسین کے تیر بہدف سے لاچار، یہ لوگ جاگیردارانہ نظام کو کسی بھی شکل میں بچانے میں ناکام رہیں گے۔ ہاں۔۔۔۔ اس نظام کے خاتمے کا سہرا کس کے سر ہوگا؟۔۔۔۔ یہ نہیں کہا جاسکتا۔

نظریاتی سیاست : ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء، بظاہر صرف ایم کیو ایم کا یوم تاسیس ہے لیکن اس دن ایم کیو ایم کے ساتھ

ہی ایسے بے شمار کاموں کی اساس رکھی گئی جن سے پاکستان کی تاریخ کا دامن ہمیشہ خالی رہا۔ ان بے شمار کاموں میں سے ایک پاکستان میں نظریاتی سیاست کا آغاز ہے۔

ایم کیو ایم کے قیام سے قبل، پاکستان میں، نظریاتی سیاست تو کیا، اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ یعنی سیاست برائے حکومت تھی اور کچھ بھی نہیں۔ اس امر کو خود پاکستان کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان کے سیاستدانوں نے حصولِ حکومت کی کوشش کے سوا کچھ اور کرنا اپنے نصب العین کے خلاف سمجھا۔ سیاست برائے حکومت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آج تک پاکستان میں کوئی سیاسی جماعت اپنی حکومتی مدت پوری نہ کر سکی۔ حکومتوں کے توڑنے یا گرانے میں ہم نے اِسقدر مشاقی حاصل کر لی کہ پاکستان میں تعمیری حزبِ اختلاف کا تصور تک پیدا نہ ہو سکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری قوم آجتک ایک طاقتور اور باصلاحیت حزبِ اختلاف کے ملکی ترقی پر پڑنے والے مثبت اثرات سے قطعی طور پہ ناواقف ہے۔

اس کے برخلاف، نظریاتی سیاستدان کو اس کے نظریے اور اس نظریے کے تحت مرتب کردہ اصولوں سے بڑھ کے، دنیا کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ اس کی تمام تر جدوجہد کا محور، خود اس کا دیا ہوا نظریہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے تمام مسائل کا حل اپنے نظریے سے فراہم کرنے کی مکمل اہلیت رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی حکومت یا نظام کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔ نظریاتی سیاستدان ہوا کے جھونکوں کے ساتھ سفر نہیں کرتا۔ اس کا اپنا ایک راستہ ہوتا ہے، جس پہ چلنے کی رفتار اور وقت کا تعین وہ خود کرتا ہے۔ وہ اپنی یا کسی اور کی حکومت کو معاشرے کے مسائل کا حل نہیں جانتا، بلکہ نظام اور رجحان میں مثبت تبدیلی کو معاشرے کی فلاح کا راستہ سمجھتا ہے۔

ہم نے یہاں محدود مضمون نویسی کے باعث، نظریاتی سیاست کی انتہائی مختصر وضاحت کی ہے، مگر یہ بھی ایک چشمِ دوربین کو کافی ہونی چاہیئے کہ اس کے آئینے میں، پاکستان کے تمام سیاستدانوں اور انکی جماعتوں کو دیکھا جا سکتا ہے، اور پھر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جناب الطاف حسین نے نہ صرف پاکستان میں نظریاتی سیاست کو متعارف کرایا، بلکہ پچیس سالہ نظریاتی جدوجہد سے نظریاتی سیاست کی عملداری بھی ثابت کر دی۔

خواتین کیلئے پُر تقدس ماحول: سیاست میں سائنسی کلیے نہیں ہوتے، لہٰذہ دُنیا بھر میں سیاسی موضوعات پر بات چھڑتے ہی اختلافِ رائے سامنے آجاتا ہے یا آسکتا ہے۔ لیکن معاشرتی خوبیاں یا بُرائیاں بڑی حد تک سائنسی کلیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ مثلاً، چوری، قتل، اغواء، وعدہ خلافی، خیانت اور غیبت جیسے اعمال کو کسی بھی معاشرے میں پسند نہیں کیا جاتا، جبکہ سچائی، محنت کشی، دیانتداری اور ایفائے عہد کو ہر معاشرے میں پسند کیا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ انسان کو اپنی پسند اور ناپسند معلوم ہے، دُنیا میں کوئی معاشرہ ایسا نہیں جسمیں خوبیاں یا خامیاں یکسر نہ ہوں۔ یقیناً ہر معاشرے میں انسان بے شمار خوبیوں کے باوجود، کچھ نہ کچھ خامیوں کے ساتھ گزارہ کرتا ہے۔ لیکن ایک معاشرتی خرابی ایسی ہے جس پہ کوئی بھی غیرت مند انسان سودے بازی گوارہ نہیں کرتا۔۔۔ اور وہ ہے خواتین کا تقدس۔ اگر کسی معاشرے میں دُنیا بھر کی خوبیاں موجود ہوں، مگر اس معاشرے کی عورت خود کو غیر محفوظ محسوس کرے، تو وہ معاشرہ انسانوں کے رہنے

کے لائق نہیں۔ لہٰذا ہماری نظر میں کسی معاشرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر عورت کو تحفظ اور احساسِ تحفظ فراہم کرے۔

الطاف حسین کی ۱۹۸۴ء میں بنائی ہوئی ایم کیو ایم کو ۱۹۸۶ء تک، یعنی صرف دو سالوں میں، جو عظیم الشان شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی، اُسکا بنیادی سبب الطاف حسین کی شخصیت کا خاصہ، یعنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کا احترام ہے۔ الطاف حسین کے دل میں، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کیلئے جو احترام ہے، وہی ایم کیو ایم کے کارکن کا مزاج اور خود ایم کیو ایم کا ماحول بنا۔ ایم کیو ایم کے میدان میں آتے ہی، سندھ کے شہری علاقوں کے اسکولوں، کالجوں، بازاروں اور محلوں سے ہزاروں وحید مراد اور محمد علی، ناپید ہوگئے اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ عیاش وڈیروں اور بے حیا سرکاری اہلکاروں کی بے لگامی کو وہ لگام لگی کہ سندھ کے شہری علاقوں کو وہ ناپاک نظر سے دیکھنا بھول گئے، اور اسطرح دیکھتے ہی دیکھتے سندھ کے شہری علاقوں میں رہنے والی خواتین کو ایک انتہائی پُر تحفظ اور خوشگوار معاشرہ میسر آیا۔

الطاف حسین کا یہ عمل انسانیت پر احسان ہے، مگر اس کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے جو خواتین کے تحفظ کا مطلب سمجھتا ہو۔

۱۴ ستمبر

عمران حسین

وہ جو حق و سچ کی مکمل تصویر ہے
جس نے بدلی قوم کی تقدیر ہے
عظمتِ انساں ہے جس کا خواب
جو خود ہر سوال کا ہے جواب
سر اٹھا کے چلو ہے اسی کی ریت
ہر عمل میں اسکے پنہاں رہتی ہے جیت
ایسا قائد کہ نہیں اسکی کوئی نظیر
پیغام ہے محبت اور امن کا سفیر
جس کے تصور سے سنورتا آج ہے
کرتا دلوں پہ جو راج ہے
اسی کی فکر سے بنتے ہیں کل کے خد و خال
عظیم مقصد سے جڑے ہیں اسکے مہ و سال
وہ ہمارا، تمہارا، سب ہی کا ہے
وہ رہبر، رہ نما تحفہ رب کا ہے

علم و عمل سے تعبیر ہیں ترقی کے خواب

صبا نجیب

علم کے بغیر عمل بے کار ہے اور عمل کے بغیر علم کا ہونا بے سود۔

علم اور عمل کا رشتہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے روح اور جسم کا رشتہ۔ علم کا مطلب کسی چیز یا واقعہ کے بارے میں معلومات رکھنا بھی ہیں اور بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے معنوں میں آج کے ترقی یافتہ دور میں سائنس، مذہب، معاشیات اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں تجسس رکھنا، ان پر اپنی دسترس قائم کرنا اور تجسس کی اس دوڑ میں ان میدانوں میں کوئی نئی دریافت کر لینا یا کسی منطقی نتیجہ پر پہنچ جانا علم کی معراج بھی ہے اور اس معراج پر پہنچ کر بھی اپنے آپکو پیاسا محسوس کرنا علم کے سمندر کی لامحدود وسعتوں کا آئینہ دار بھی ہے۔

علم نظریہ بھی ہے اور شعوری ارتقاء کا ذریعہ بھی.......... علم اچھے برے کی تمیز سکھاتا ہے تو بہتر زندگی گذارنے کا درس بھی.......... علم ذہن کی وسعتوں کو کشادہ کرتا ہے اور جدو جہد پر آمادہ بھی.......... علم غلامی سے نفرت کا سبق بھی ہے اور آزادی کی لگن بھی .... علم مذہب بھی ہے اور تبدیلی کا سبب بھی.......... علم فکر و شعور بھی ہے اور ترقی کا ظہور بھی.......... علم رہبر بھی ہے اور تجسس کا محور بھی.......... علم معمار بھی ہے اور بہترین ہتھیار بھی۔

علم نے ہر دور میں انسانی تہذیب و طرزِ معاشرت میں بنیادی تبدیلیوں کو جنم دیا اور ماضی کو حال اور حال کو مستقبل کا رنگ دیا۔ جیسے جیسے انسان نے شعوری ارتقاء کی منزلیں طے کیں اسنے اپنے ماحول اور طرزِ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے علم کا سہارا لیا اور علم کی بنیاد پر اپنے رہن سہن اور طرزِ معاش کو نت نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے فیصلے کئے۔

Stone age سے لیکر آج Modern Civilized World تک تمام تر سائنسی ایجادات اور تخلیقات علم ہی کا کرشمہ ہے۔

غاروں سے آج کی بلند و بالا عمارتوں تک اور اونٹ کی سواری سے گاڑی، ہوائی جہاز اور پھر چاند گاڑی اور مریخ تک کا خلائی سفر سب ہی علم کے گرد گھومتا ہے۔

جاننے، سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت جب یکجا ہو کر عمل کی صورت اختیار کرلے تو علم و عمل کا یہ حسین امتزاج تعمیر و ترقی کے نئے دروازے کھول دیا کرتا ہے۔

عمل اگر اچھا ہو مگر انسان کے ماضی اور حال کے تجربات اور مستقبل کے خیالات سے مطابقت نہ رکھتا ہو یعنی جاننے، سمجھنے اور آگے تک دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو یا دوسرے لفظوں میں علمی تقاضوں سے عاری عمل ہو تو پھر ایسا عمل "ایڈہاک ازم" کی بنیاد تو ہو سکتا ہے لیکن مستقل بنیادوں پر صرف وہی عمل کارگر ثابت ہو سکتا ہے کہ جس نے علم کے تقاضوں سے گذر کر عمل کی صورت اختیار کی ہو۔

وہ عمل جو علم کی رہگذر سے ہو کر جنم لے وہی عمل انسان کی انفرادی اور کسی بھی قوم کی اجتماعی آسودگی کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح عبادت کا عمل تو کیا جائے مگر اسکی بنیادی روح اور علم سے واقفیت ہی نہ ہو تو ایسی عبادت کا عمل بھی بالکل بے کار ہو جاتا ہے۔

علم کے توسط سے قدرت کے پوشیدہ خزانوں تک نہ صرف رسائی ممکن ہے بلکہ اپنے عمل کے زور پر ان خزانوں کو مسخر کر لینا بھی ممکن ہے۔

قدرت کے وہ خزانے کہ جو انسانی نظروں سے اوجھل ہیں محض علم پر دسترس انسانی نظر سے وہ پردے اٹھا دیتی ہے اور انسان ان خزانوں کو نہ

صرف تلاش کر لیتا ہے بلکہ اپنے عمل سے یہ سارے خزانے انسانی فلاح و بہبود کے لئے مسخر کر لیتا ہے۔

ایسے خواب کہ جو انسانی تعمیر و ترقی سے مشروط ہوں جب تک پورے نہیں ہو سکتے کہ جب تک وہ علم و عمل کے زیور سے آراستہ نہ ہوں۔

ترقی چاہے وہ انسانی شعور کی ہو یا معاشرے کی، جسمانی، معاشی یا سیاسی غلامی سے آزادی تک کا سفر ہو یا قوم کے سوئے ہوئے ذہنوں کو جگانا ہو اور انکی ذہنی و فکری ترقی کا سامان کرنا ہو تو وہ بھی علم و عمل کے بغیر ممکن نہیں۔

جب تک ایک نظریہ، ایک فکر اور سوچ موجود نہ ہو تو شعور پروان نہیں چڑھتا، یعنی فکری ترقی کا سبب نہیں بنتا اور جب اس فکر، نظریہ اور شعوری ارتقاء کو سچے اور پر خلوص عمل کی حمایت حاصل ہو تو پھر کسی بھی قوم کی فکری، شعوری اور ذہنی ترقی اس نہج پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ جدوجہد پر آمادہ ہوتی ہے اور ایسی جدوجہد آگے چلکر بڑے انقلابات کو جنم دیتی ہے۔

کسی بھی انقلابی جدوجہد کے پیچھے جب تک علم اور عمل نہ ہو تو ایسی جدوجہد ایک خواب تو دیکھ سکتی ہے مگر اس خواب کی تعبیر حاصل نہیں کر سکتی۔

علم و عمل کے ملاپ سے دنیا بھر میں معاشی، سیاسی اور سماجی انقلابات نے جنم لیا اور آج کے دورِ جدید میں یہی علم و عمل کا مشترکہ نسخہ ترقی کا ضامن ہے۔

۲۱ویں صدی کا انقلاب تعمیر و ترقی ہے اور مستقبل انہی قوموں کا ہو گا کہ جو علم و عمل کے ہتھیار سے ترقی کے خواب کو حقیقت کا رنگ دیں گی۔

دوسری جنگِ عظیم میں جاپان، جرمنی، فرانس اور برطانیہ جس تباہی و بربادی کا شکار ہوئے اسکی مثال شاید ہی کہیں تاریخ میں ملتی ہو لیکن بڑی تعداد میں ہلاکتوں اور تباہی و بربادی کے یہ مناظر بہت جلد ہی قصہ پارینہ بن گئے اور ان قوموں نے علم کے حصول اپنے عزم اور عمل کے ذریعے تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کیں اور آج یہی ممالک صنعتی، معاشی اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی کا مرکز کہے اور سمجھے جاتے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، خلائی سفر، کلوننگ، صنعتی انقلاب اور گلوبلائزیشن کا عمل کل تک محض ایک خواب تھے لیکن آج یہی خواب انسانی ترقی کہلاتے ہیں اور یہ ترقی علم و عمل کے مشترکہ فارمولے کا محض آغاز ہے۔

جو قومیں آج علم و عمل سے بھرپور استفادہ حاصل کر رہی ہیں وہ ترقی کی معراج پر پہنچ رہی ہیں اور دنیا انکو ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل کر چکی ہے۔ اسکے برعکس وہ قومیں جو آج بھی علم سے بے بہرہ ہیں اور جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہیں دنیا انکو انتہائی تحقیرانہ انداز میں ترقی پذیر ممالک یا دوسرے لفظوں میں Third World Countries کی صف میں شمار کرتی ہے کہ جہاں یہ ممالک اپنے روز مرہ کے امور تک چلانے کے لئے کسی ترقی یافتہ ملک کی امداد کے محتاج رہتے ہیں اور آخر کار ایسی قومیں اپنی اجتماعی خودداری اور ملکی سالمیت کا سودا کر کے مکمل تباہی و بربادی کے راستے پر چل پڑتی ہیں۔

وہ زندہ قومیں جو اپنے تباہ حال ماضی سے سبق حاصل کر کے اپنے مستقبل کو تراشنے کا عہد کرتی ہیں اور خود کو "علم و عمل" کے ہتھیار سے مسلح کر لیتی ہیں وہ مسلسل جدوجہد کے بعد ایک نہ ایک روز ترقی کے خواب کی تعبیر حاصل کر لیتی ہیں۔

زندہ قوموں کا یہی مقولہ ہے۔ ــــــ علم و عمل سے تعبیر ہیں ترقی کے خواب ــــــ

غزل

عطیہ نیازی

آگ میں، خون میں اترنا ہے
زندگی اب تجھے سنورنا ہے
ان کے وعدوں پہ اعتبار کیا
جانتے تھے انہیں مکرنا ہے
سر سے پانی گذر نہ جائے کہیں
کچھ تو کر لو اگر ابھرنا ہے
کیوں نہ اک ہار میں پرو ڈالوں
ایسے موتی جنہیں بکھرنا ہے
پیش بندی کرے کوئی اس کی
ایک دریا جسے بپھرنا ہے
روشنی کی کرن تو پڑنے دو
رنگ کچھ اور بھی نکھرنا ہے
دل کو میلا نہ کیجئے صاحب
ان خیالات کو سدھرنا ہے
یہ گھڑی بھی گذار لو عطیہ!
اب تمہیں جان سے گذرنا ہے

اِس عہدِ بے ہنر میں اِک باکمال شخص

شازیہ ارشاد

خداوند تعالیٰ بعض شخصیات میں صلاحیتوں، فہم وفراست، ہمت، بُردباری، بہادری اور خلوص ومحبت کا ایک ایسا سمندر سمو دیتا ہے کہ اِن شخصیات کی حیثیت صرف عام اِنسان کی طرح نہیں رہتی، بلکہ یہ اِسقدر ہمہ اوصاف شخصیات کے مالک بن جاتے ہیں کہ اِن کی ذات پوری تحریک معلوم ہونے لگتی ہے، اور عام لوگوں کی طرح رہنے والے خاص لوگ جب کبھی تحریک کا بیڑا اُٹھاتے ہیں، تو خوشبو کے سفیر بنے لطافت کا ایسا اِحساس چہار سُو پھیلا دیتے ہیں کہ سارا اِحساس سمٹ کر ایک نام بن جاتا ہے۔ الطاف حُسین۔

الطاف حُسین ایک اِحساس ہی تو ہے، جسے مٹایا نہیں جاسکتا۔۔۔۔قید نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔ سمیٹا نہیں جاسکتا۔۔۔۔دبایا نہیں جاسکتا۔۔۔۔اِحساس۔۔۔۔ایک ایسا مہکتا ہوا اِحساس۔۔۔۔ جسے پھیلنے سے روکا نہیں جاسکتا۔ بہتقدر خوش نصیب ہوتی ہیں وہ مائیں جو عظیم ہستیوں کو جنم دیتی ہیں، اور اُنکی اولاد اِنسانیت کیلئے کارہائے نمایاں سر انجام دیتی ہے۔ تو وہ مائیں اپنی آغوش کے پھولوں کی مہک سے ساری دُنیا کو مہکتا دیکھ کر سرشار ومسرور ہوجاتی ہیں۔ اِنکا اور اُنکی اولاد کانام تاریخ میں سُنہری حرفوں میں امر ہوجاتا ہے۔

ایسی ہی ایک معتبر ہستی، محترمہ خورشید بیگم ہیں، جنھوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ کو ایک ایسے گوہرِ نایاب کو جنم دیا جسنے اپنے علم وفراست اور جدوجہد سے تمام قوم کی تقدیر بدل ڈالی۔ محترمہ خورشید بیگم کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد حافظ رحیم بخش مشہور عالم دین تھے۔ شادی کے بعد جب محترمہ خورشید بیگم، محترم نذیر حُسین صاحب کی زندگی میں آئیں تو وہاں بھی دینی ماحول پایا۔ اُنکے سُسر مولانا مفتی رمضان حسین، آگرے کے جید عالم دین اور مفتی تھے۔ کون جانتا تھا کہ ۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ کو جنم لینے والا یہ بچہ اپنے عہدِ جوانی میں ہی کروڑوں دلوں کو تسخیر کر کے تاریخ کا ایک نیا باب رقم کریگا۔ عین جوانی میں، جبکہ ہر چمکتی چیز سونا نظر آتی ہے، بے فکری اور لااُبالی پن طبیعت میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ ایسے میں کتنا منفرد ہوگا وہ نوجوان جو بیس پچیس سال کے خوبصورت عہدِ جوانی میں زندگی کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنے اِردگرد، پھیلی زمانے کی ناانصافیوں پر کُڑھتا ہو۔۔۔۔ جسکی آنکھیں اپنے مستقبل کے سپنے سجونے کے بجائے اپنی قوم کے جوانوں کے مُستقبل کے خواب بُنتی ہوں۔

اِس عہدِ بے ہنر میں اِک باکمال شخص
پھر آج ہمکو مل گیا اِک لازوال شخص

جب بھی خزاں نے کوشش قتلِ گُلاب کی
اُترا بہار بن کے وہی باکمال شخص

(اس عہدِ بے ہنر میں آپ باکمال شخص ہیں)

اور جب اس عہدِ بے ہنری میں اس باکمال شخص نے اپنی قوم کے ساتھ ہونیوالی ناانصافیوں کے خلاف آوازِ حق بلند کی تو ایلیانِ وقت نے سازشوں کے جال بُننے شروع کردیے۔۔۔ شب خون مارنے کی تیاریاں کی جانے لگیں ۔۔۔ کہ مظلوموں نے جب جب ظالموں کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کی تب تب ظالموں نے شکنجے کو کسنے کیلئے مظالم کے سلسلے کو تیز تر کردیا۔

۱۱ جون ۱۹۷۸ء کو جامعہ کراچی کی فضاؤں میں بلند ہونیوالا نعرۂ حق، جامعہ کراچی کی فضاؤں میں چہار سو خوشبو بکھیرنے لگا۔ حق پرست طلبہ و طالبات اس نڈر و بیباک نوجوان کا ساتھ دینے آگے بڑھنے لگے۔ مگر جب ۳ فروری ۱۹۸۱ کو الطاف حسین اور انکے ساتھیوں پر جامعہ کراچی کے دروازے بند کردیے گئے کہ اسطرح اس نوجوان کے مضبوط ارادوں کو آگے بڑھنے سے روکا جاسکے گا، مگر نادان اربابِ اختیار اتنا نہیں جانتے تھے کہ ہواؤں کو چلنے اور خوشبوؤں کو پھیلنے سے کوئی روک سکا۔ طوفان پہ بند باندھنا آسان کام نہیں ہوتا۔۔۔ سو یہ قافلہ آگے بڑھتا گیا۔ زمانے کے خداؤں، الطاف حسین کے مضبوط ارادوں کو شکست دینے میں ناکام رہے۔ اور ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ کو مہاجر قومی موومنٹ کی باقاعدہ بنیاد ڈالکر الطاف حسین نے ثابت کردیا کہ

ارادے جنکے اونچے اور نظر جنکی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

اور پھر دُنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

الطاف حسین کے جانثاروں میں جس طرح اضافہ ہورہا تھا اور اس صدائے حق پر لبیک کہنے کے لئے سب ایک پرچم تلے جمع ہورہے تھے ۔۔۔۔ عجب سماں تھا۔

ظلم کی چکی میں پسنے والے مظلوموں کیلئے الطاف حسین کا ساتھ تپتے صحرا میں بارش کی بوند کی مانند تھا۔ مگر یہ حاکمِ وقت کو پسند نہیں آیا کہ اس جدوجہد کی کامیابی کا مطلب تھا پاکستان کی ترقی و کامیابی۔۔۔ پاکستان کا استحکام۔۔۔ جو انھیں کسی طور منظور نہ تھا۔ سو، مظالم کا ایک نہ ختم ہونیوالا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سندھ کے شہر ۱۸۵۷ء کی میرٹھ چھاؤنی کا منظر پیش کرنے لگے۔ گلی گلی گھروں سے دھواں اٹھتا نظر آنے لگا۔ ہر طرف خون آشام درندے بے بس اور نہتے عوام کا شکار کرتے پھر رہے تھے۔۔۔ یہ دہشت گرد ہیں۔۔۔ را کے ایجنٹ ۔۔۔ انکی نسلوں کو مٹا دو۔ جناح کے پاکستان میں ۔۔۔ بانیانِ پاکستان کی اولاد سے خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ ماؤں، بہنوں کی حرمتوں کو پامال کیا جانے لگا۔۔۔ چہار سو اندھیرا تھا۔۔۔ کالی کریہہ رات کا اندھیرا۔۔۔ ظلمتوں کی شب کا اندھیرا۔۔۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دینیوالا اندھیرا ۔۔۔ مگر۔۔۔ اس عظیم قائد کے باوفا جانثار، جنھیں اُنکے قائد کے علم و فراست و تربیت نے کندن بنا دیا تھا۔ وہ اس راہِ حق کو روشنی بخشنے کیلئے ڈٹے رہے۔۔۔ وہ حوصلوں کا ایندھن اپنے قائد سے لیکر اپنے اندر اُتارتے رہے۔ جب اُنکے قائد نے قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرلیں ۔۔۔ اور اُنکے ارادوں کو شکست نہ دی جاسکی۔۔۔ تو انکے جیالوں کو کیسے جھکایا جاسکتا تھا۔ جب اُن کے قائد نے ہر ظلم و ستم سہا۔۔۔ مگر انکے حوصلے ٹوٹا

رہے۔۔۔۔ تو اُن کے جانثاروں پہ ہونے والا مظالم بھی شرما گئے۔۔۔۔ وہ راہِ حق کے جواں سپاہی۔۔۔۔ عظیم رہبر کے۔۔۔۔ جیالے ساتھی۔۔۔۔ کہ جن کے سینے چٹان کی مانند مضبوط ہو چکے تھے۔۔۔۔ ظلم کے آگے ڈٹے رہے۔۔۔۔ لہو بہا کے ڈٹے رہے۔۔۔۔ اور اُن کے حوصلے نے۔۔۔۔ ظلم کی شب کو بتا دیا ہے۔۔۔۔ اندھیری کالی کریہہ شب کو۔۔۔۔ خود اپنے خون کا چراغ دے کے۔۔۔۔ سحر میں تبدیل کر دیا ہے۔ سحر جو شب سے عظیم تر ہے۔۔۔۔ جو غم شبِ ظلم نے دیا۔۔۔۔ وہ غم سحر کا یقین بن گیا۔ یقین جو غم سے قریب تر ہے۔۔۔۔ سحر جو شب سے عظیم تر ہے۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ راہ میں رُک نہیں جانا۔۔۔۔ کہ سفر باقی ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اپنے عظیم رہنما کی رہنمائی میں اِس سفر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے۔ قدم بقدم۔۔۔۔ اپنے قائد کے ساتھ۔۔۔۔ حق پرستوں کے کارواں میں شریک ہر ایک کو اپنے اپنے محاذ پر جنگ لڑنی ہے۔۔۔۔ عمل کی جنگ۔۔۔۔ قلم کی جنگ۔۔۔۔ اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔۔۔۔ پورے انصاف اور ایمانداری کے ساتھ۔۔۔۔ کہ یہی ہمارا عہد بھی ہے اور وعدہ بھی۔۔۔۔ اپنے آپ سے بھی اور قائد سے بھی۔۔۔۔

اور روشن رہِ سفر کر دو
شوقِ منزل کو مختصر کر دو
جب بہکنے لگیں تمہارے قدم
عزمِ راسخ کو راہبر کر دو
کر کے روشن لہو سے سارے چراغ
شبِ تاریک کو سحر کر دو

تجدید

شکیل صدیقی

چلنا چاہتے ہو جو تم حق کی چاہ میں
ابھی کچھ اور مسافتیں بھی ہیں راہ میں

اپنے جذبوں کو یوں سرشار کرو
نذر اپنا سب کچھ بر دار کرو

آگ میں یوں گل کھلائے تم نے
وفا کے جو دیپ جلائے تم نے

ستم گروں کی اب گردنیں خم ہوں گی
انہی وفاؤں سے یہ مسافتیں کم ہوں گی

آؤ پھر اس عہد کی تجدید کریں
جو کہے قائد بس اسی کی تقلید کریں

وہ تاریخی لمحات ....

(امریکہ یونٹ)

[illegible] عمران حسین

۲۰ مئی ۲۰۰۰ء کو صبح تقریباً ۹ بجے میں لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترا۔ نیویارک سے لندن تک کا یہ سفر محض سات گھنٹے کا تھا لیکن میرے لئے یہ سات گھنٹے ایک صدی کا عرصہ معلوم ہو رہے تھے کہ دوران پرواز ایک اضطراب تھا کہ کسی طور جلد از جلد لندن پہنچیں اور برسوں کا پایا یوں لگے کہ تقریباً ایک دہائی پر پھیلا میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے

یہ خواب لندن کے حسین شہر اور اسکے خوبصورت نظاروں سے محظوظ ہونے کا ہرگز نہیں تھا بلکہ ایک شخص سے ملاقات کرنے کا دیرینہ خواب تھا کہ جو خود لندن میں برسوں سے جلاوطنی کی کربناک زندگی گذارنے پر مجبور ہے

یہ خواب تھا ایک کارکن کا اپنے قائد سے بالمشافہ ہونے کا ....

یہ خواب تھا نظریہ کے ماننے والے کا نظریہ کے خالق کو دیکھنے کا ....

یہ خواب تھا ایک انسان کا ایک عظیم انسان سے ملنے کا ....

کہتے ہیں کہ اگر لگن سچی ہو اور ارادے مضبوط ہوں تو پھر بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی آپ کا راستہ نہیں روک سکتی۔ کسے معلوم تھا کہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے محبوب قائد جناب الطاف حسین سے ملنے لندن جاؤں گا۔

جب میں لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترا تو باہر دو تحریکی ساتھی بڑی بے چینی کے ساتھ میرے منتظر تھے دونوں نے مجھے لندن میں خوش آمدید کہا دوران گفتگو یہ دونوں ہی ساتھی شاید میری بے چینی کو بھانپ چکے تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پہلے مجھے ایم کیو ایم انٹرنیشنل سیکریٹریٹ لے جائیں تاکہ میری اس بے چینی کا ازالہ ہو سکے اور میں وہاں تحریکی ساتھیوں سے ملاقات کر کے اپنی اس نئی صبح کا آغاز کر سکوں۔ چنانچہ ہم ایئرپورٹ سے سیدھے ایم کیو ایم کے انٹرنیشنل سیکریٹریٹ واقع ایجویر کی طرف روانہ ہوئے

تقریباً آدھ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم ایم کیو ایم کے مرکزی دفتر پہنچے جو دراصل ایک پانچ منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر واقع ہے یہاں پہنچ کر ہی مسافت کی ساری تھکن اور من میں بے چینی کے احساس کا خاتمہ ہو چکا تھا جیسے ہی انٹرنیشنل سیکریٹریٹ میں داخل ہوا تو وہاں تحریکی ساتھی پہلے ہی سے موجود اور اپنے کام میں مگن تھے میری وہاں آمد پر انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا

یہاں مجھے ان ساتھیوں کے چہرے بھی نظر آئے جو برسوں سے اپنے وطن سے دور ہیں اور حالات کے جبر کی بنا پر یہاں لندن میں جلاوطن ہیں لیکن آج بھی اسی عزم کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں

ایم کیو ایم کے انٹرنیشنل سیکریٹریٹ پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ یہ دفتر لندن کے انتہائی متوسط علاقے میں واقع ہے اور جس سادگی سے اس آفس کو سنوارا گیا ہے وہ کسی کو بھی یہ بتا دینے کے لئے بہت کافی ہے کہ ایم کیو ایم کا مرکزی دفتر چاہے کراچی میں ہو یا لندن میں بہرحال ایک متوسط اور غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی جماعت ہی کی نمائندگی کرتا ہے

چار کمروں پر مشتمل اس انٹرنیشنل سیکریٹریٹ میں کمپیوٹرز، فیکس مشین اور جدید ٹیلی فونک نظام سے لیکر کسی بھی تنظیم کو چلانے کے لئے انتہائی ضروری سامان موجود ہے اور یہاں موجود تحریکی ساتھی اپنی پوری مہارت کے ساتھ آفس کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے تھے

یہاں پہنچ کر میری اپنے پیارے پیارے تحریکی ساتھیوں سے ملاقات تو ہو گئی مگر میں جس مقصد کے لئے خاص طور پر لندن آیا تھا اسکی بے چینی اور اضطراب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مزید بڑھ رہا تھا کہ کب اور کیسے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے قائد سے ملوں گا...... وہ لمحہ کیسا ہوگا...... میرے احساسات کیا ہونگے...... میرا قائد میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا...... میری خوشی کی کیا انتہا ہوگی؟

یہ سارے سوالات بس اس لمحہ کو پانے کے لئے بے تاب تھے اور اسکو پاکر یہ اپنا دیرینہ خواب حاصل کر لیتے مگر اس لمحہ کی تلاش تھی اور میں اس تلاش میں اپنے تئیں گم تھا۔

۲۲ مئی ۲۰۰۰ یعنی دو دن کے انتظار کے بعد میری دعائیں رنگ لائیں اور وہ گھڑی آن پہنچی کہ جو میری زندگی کا حاصل تھی کہ جس لمحہ کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔

شام تقریباً چار بجے قائد تحریک جناب الطاف حسین ایم کیو ایم انٹرنیشنل سیکریٹریٹ میں داخل ہوئے تو اچانک اس لمحہ کو پاکر اور اپنے محبوب قائد کو اپنے سامنے دیکھ کر میں تو جیسے ساکت ہی ہوگیا۔

میں اس لمحہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے پاس قید کر لینا چاہتا تھا کہ جب میں اور میرا قائد بالکل آمنے سامنے تھے۔ میری برسوں کی تمنا، برسوں کی چاہت اور برسوں کی مسافت شاید ایک لمحہ میں ہی پایہ تکمیل تک پہنچ گئی۔

میری خوشی کی انتہا ہی نہیں رہی کہ جب قائد تحریک جناب الطاف حسین نے مجھے میرے نام سے پکارا اور پھر مجھے اپنے گلے لگایا۔ اپنے قائد سے گلے لگ کر میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح خود پر قابو پاؤں۔ بس دل کرتا تھا کہ رو دوں مگر ان نادر لمحات کو میں خوشیوں کا نام دینا چاہتا تھا شاید اسی لئے میں نے خود پر قابو پایا۔

حال احوال پوچھنے اور امریکہ میں جاری تنظیمی سرگرمیوں پر چند سوالات کے بعد قائد تحریک نے ہماری ایک مختصر سی فکری نشست لے لی اور انتہائی سادہ الفاظ اور شاندار مثالوں کے ساتھ اس فکری نشست کا وہ خوبصورت اور مکمل تجزیہ دیا کہ شاید ہم برسوں کے علم کے باوجود حاصل نہ کر پاتے اور یوں پہلی بار آمنے سامنے قائد تحریک سے نشست ہونا میری زندگی کی سب سے بڑی خوش نصیبی تھی اور یہ ایک ایسے عظیم استاد اور مفکر کا درس تھا کہ جس کی تمنا ہر طالب علم ہی رکھتا ہے۔

اس نشست کے بعد قائد تحریک جناب الطاف حسین نے مجھے اپنے Meeting Room میں طلب کیا اور وہاں مجھ سے ون ٹو ون ملاقات کی اور بحیثیت طالب علم و کارکن میری ایسی شاندار پذیرائی کی کہ جو میرے نزدیک کسی بھی کارکن کے لئے اسکی معراج کہی جاسکتی ہے۔

قائد تحریک کی سحر انگیز شخصیت نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ انکی سادگی، بردباری اور قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال شخصیت کو شاید ہی میں کبھی الفاظوں میں قید کر سکوں۔

قائد تحریک جناب الطاف حسین اپنے کارکنوں سے کس قدر محبت کرتے ہیں اور انکا کس قدر خیال رکھتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قائد تحریک نے اپنے ہاتھوں سے دوپہر کا کھانا بنا کر ہمارے اور دیگر ساتھیوں کے لئے آفس بھیجا اور تھوڑی بعد ہی آفس فون کر کے تمام ساتھیوں سے پوچھا کہ انہوں نے طریقے سے کھانا کھایا یا نہیں؟

اپنے قائد کے ہاتھ کا بنا لذیذ کھانا کھا کر میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید ہی آج کے دور میں ایسا کوئی لیڈر موجود ہو کہ جو اپنے کارکنوں کو اس قدر چاہتا اور پیار کرتا ہو۔

اگلے دن ہی میں نے قائد تحریک کی عظیم قیادت کے نام ایک نئی انگریزی نظم لکھی جس کا عنوان دیا "Dedication" اور یہ تہیہ کر لیا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو یہ نظم اپنے قائد کے گوش گذار کروں گا۔ اسی دعا کے ساتھ انٹرنیشنل سیکریٹریٹ میں تحریکی ساتھیوں کے ساتھ مل کر تحریکی کام کرتا رہا۔ شاید یہ دعا کی قبولیت ہی کی گھڑی تھی۔

۲۴ مئی ۲۰۰۶ء کی شام قائد تحریک جناب الطاف حسین انٹرنیشنل سیکریٹریٹ تشریف لائے تو میں وہاں موجود تھا۔ قائد کو اپنے درمیان پا کر ایک بار پھر میری خوشی دوبالا ہو گئی۔ میرا ایک اور خواب پورا ہو گیا کہ جب میری خواہش پر میرے قائد نے میرے ساتھ زندگی کی چند یادگار تصاویر بنوائیں۔ وہ تصاویر کہ جو اب میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اسکے بعد قائد تحریک نے مجھ سے فوراً ہی مخاطب ہو کر کہا کہ "میاں اپنی نظمیں وغیرہ لے آؤ اور سب کے سامنے سناؤ"۔

یہ میرے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ میرا قائد میری چند لکھی ہوئی نظمیں سننا چاہ رہا ہے۔

میں نے تمام تحریکی ساتھیوں کی موجودگی میں قائد تحریک جناب الطاف حسین کے لئے لکھی گئی تازہ نظم "Dedication" سنائی تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قائد کو یہ نظم اس قدر پسند آئے گی کہ انھوں نے اس نظم کے آخر میں مجھے خوب داد دی اور وہاں موجود تمام تحریکی ساتھیوں نے میری خوب حوصلہ افزائی کی۔

میری زندگی کا حاصل تو شاید وہ لمحہ تھا کہ جب میرے قائد نے اس نظم کے اختتام پر مجھے انعام سے نوازا۔ یہ انعام میرے لئے کسی بھی کالج اور یونیورسٹی کی ڈگری سے کہیں زیادہ بڑھ کر تھا اور میرے سامنے اگر دنیا بھر کی دولت کے انبار بھی لگا دیئے جائیں تو اس انعام کے نزدیک وہ سب ہی پھیکے پڑ جائیں گے

نہ چاہتے ہوئے بھی لندن میں قیام کے یہ دن انتہائی تیزی کے ساتھ گذر گئے اور وہ وقت بھی آگیا کہ جب مجھے واپس امریکہ روانہ ہونا تھا۔

امریکہ روانگی سے قبل قائد تحریک جناب الطاف حسین نے مجھے شاباش دی اور میرا ایسا حوصلہ بڑھایا کہ لگتا تھا جیسے میرا خون سو گنا زیادہ بڑھ گیا ہے۔

یہاں سے نئی توانائیاں حاصل کر کے اور ایک نئے عزم کو لے کر اپنے محبوب قائد سے الوداعی ملاقات کے بعد میں اگلی صبح نیویارک کی جانب محو پرواز تھا اور دوران پرواز نجانے کب اس بے چینی نے دل میں پھر گھر کر لیا کہ کب اور کہاں ایک بار پھر اپنے قائد سے بالمشافہ ملاقات ہو گی۔

کہ کب وہ تاریخی لمحات .... میری زندگی میں پھر لوٹ آئیں گے

۔ کب آخر کب۔

ان تاریخی لمحات کا منتظر

۔ ایک کارکن۔